اردو انشائیہ اور احمد جمال پاشا

(۱۹۴۵ء تا ۱۹۹۰ء)

ڈاکٹر سید معصوم رضا

اردو انشائیہ اور احمد جمال پاشا

(۱۹۴۵ء تا ۱۹۹۰ء)

ڈاکٹر سید معصوم رضا

یہ کتاب دہلی اردو اکادمی (حکومت دہلی) کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

نام کتاب	:	اردو انشائیہ اور احمد جمال پاشا
مصنف	:	ڈاکٹر سید معصوم رضا - 9811914130
پتہ	:	C-123 تیسری منزل، ویسٹ ونود نگر، دہلی 110092
اشاعت	:	۲۰۰۵ء
ضخامت	:	۱۴۴ صفحات
قیمت	:	[illegible] روپے
ناشر	:	مصنف
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	شبیر احمد
سرورق	:	فرید الحق، دہلی 9811883369
طباعت	:	نیشنل پرنٹرس، روبی آرٹ پریس، دہلی

﴿تقسیم کار﴾

۱۔ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ، بہار

۲۔ ملک بک ڈپو ۳۲۱۲، ترکمان گیٹ، دہلی ۔۱۱۰۰۰۶

۳۔ نصرت پبلیشر، امین آباد، لکھنؤ

Urdu Inshaiya Aur Ahmed Jamal Pasha

Dr. Syed Masoom Raza - 9811914130

First Edition 2005

Price Rs 75.00

انتساب

بھیا اور بہنا کی نذر

میں آج جو کچھ بھی ہوں وہ انھیں کی قربانیوں،

محبتوں اور شفقتوں کا ثمرہ ہے

س۔م۔ر

جلانے والے جلاتے ہی ہیں چراغ اپنا
یہ کیا کہا کہ ہوا تیز ہے زمانے کی

جمیل مظہری

فہرست

جنھیں بھروسہ ہے آسماں پہ وہ آسماں سے پناہ مانگیں
میں اپنے ذرّوں سے مطمئن ہوں میں چاند تاروں کا کیا کروں گا

ارشد صدیقی

پیش لفظ

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب بھی سماج میں کوئی تحریک چلی ہے اس نے ادب کو متاثر کیا ہے اور جب بھی ادب میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی ہے اس کا اثر سماج پر بھی پڑا ہے۔ خواہ ۱۸۵۷ء کی پہلی تحریک آزادی ہو یا جنگِ عظیم۔ دوسری طرف سرسید تحریک ہو یا ترقی پسند تحریک۔ ہر تحریک نے انسان کو ذہنی اور جسمانی غلامی سے نجات دلانے کی کوشش کی ہے آزاد ہندوستان کے ساتھ تقسیم ہند کا مسئلہ بھی رہا جس نے سماج اور معاشرے میں بے چینی، انتشار اور نفرت کو جنم دیا ساتھ ہی ادب میں نئے نئے موضوعات کے انبار لگ گئے ہیئت کے نئے نئے تجربے ہوئے اور اسکی شکست و ریخت نے اردو انشائیہ کو توانائی بخشی۔ اردو انشائیہ آزادی سے چند سال قبل ہی وجود میں آیا اور رفتہ رفتہ اسے باضابطہ ایک صنف کی حیثیت حاصل ہو گئی ادب کی کوئی بھی صنف اچانک وجود میں نہیں آجاتی بلکہ اس کا خمیر معاشرے سے تیار ہوتا ہے جب کسی مخصوص طرزِ تحریر میں اپنے عہد اور حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ ادب میں کسی خاص صنف کی شکل میں متعارف ہوتی ہے۔ انشائیہ کی صورتحال بھی یہی ہے۔

ہر عہد میں معاشرتی، تہذیبی علمی اور فکری سطح پر رونما ہونے والے واقعات افکار اور انکشافات ہی دراصل مختلف ادبی اصناف کے وجود کا پس منظر ہوتے ہیں۔ دوسری طرف ادیب اپنے عہد سے جدا نہیں ہوتا بلکہ وہ جس عہد میں سانس لیتا ہے اس کا رشتہ ماضی اور مستقبل سے استوار کرتا

ہے جس میں ماضی کے دھند لکے اور مستقبل کا عکس صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ادب سے اصلاح معاشرہ کا کام لیا جاتا ہے لیکن انشائیہ میں فنکار یا ادیب انکشاف ذات کو اظہار کا وسیلہ بناتا ہے اور اسکی تخلیق میں اس کے سماج و معاشرے کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ معاشرے کی بے چینی، بدعنوانی اور انتشار کے کرب کو محسوس کر کے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کو غیر رسمی انداز میں قلم بند کرنا ہی انشائیہ نگاری ہے۔ اردو میں انشائیہ کی روایت بہت پرانی نہیں ہے بلکہ آزادیٔ ہند اور اردو انشائیہ دونوں تقریباً ایک دوسرے کے ہم جولی ہیں۔ اس لئے زمانے کے ساتھ ساتھ ہندوستان نے جتنی ترقی کی اردو انشائیہ نے بھی ادب میں اپنی پہچان بنالی۔ ہندوستان میں اردو انشائیہ نگاری کی بحث کافی دلچسپ ہے۔ جس کا ذکر اس کتاب کے پہلے باب میں کیا گیا ہے۔ اردو انشائیہ نگاری میں احمد جمال پاشا کا نام ایک معتبر نام ہے۔ جب انھوں نے انشائیہ لکھنا شروع کیا تو ان کا قیام سیوان میں تھا اس لئے علاقائی قربت نے مجھے ان کے انشائیوں کی طرف راغب کیا۔ گریجویشن میں میں نے اردو زبان کا بھی ایک پیپر دیا تھا اس لئے اردو انشائیہ اور احمد جمال پاشا سے بخوبی واقفیت ہو چکی تھی لیکن اسی اثناء میں احمد جمال پاشا نے اس دار فانی سے کوچ کیا۔ انتقال کے بعد ادبی حلقوں میں بڑی گہما گہمی رہی ان کے عزیز و اقارب اور ادبی دوستوں نے اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور یہ چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ مجھے اس بات کا افسوس رہا کہ میں احمد جمال پاشا سے مل نہ سکا دورانِ تحصیل علم مختلف اخبار و رسائل پڑھنے کا موقع ملتا تھا ان میں احمد جمال پاشا کے انشائیے اور مزاحیے میری نظر سے گذرتے رہتے تھے ان کے انتقال کے بعد خصوصی نمبر بھی پڑھنے کا موقع ملا لیکن ہمیشہ مجھے اس بات کا افسوس رہا کہ میں پاشا کے شہر میں رہ کر ان سے نہ مل سکا۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد جب ایم۔ فل میں مجھے داخلہ ملا اور مقالہ کے موضوع پر بحث چلی تو میں نے احمد جمال پاشا کی انشائیہ نگاری کو اپنا تحقیقی موضوع بنایا اور جہاں تک ممکن ہو سکا میں نے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی لیکن ایک محدود دائرے میں رہ کر یہ کام کرنا پڑا اس لئے میں نے اسی اثناء میں یہ ذہن بنالیا کہ اردو انشائیہ اور احمد جمال پاشا کے حوالے سے ایک کتاب منظرِ عام پر لانے کی کوشش کروں۔ اس ضمن میں مجھے جو بھی مواد ملتا رہا اسی کے حوالے اور تجزیے سے میں نے جو کچھ بھی کیا اسے کتابی شکل میں پیش کرنے کی سعی کر رہا ہوں۔ احمد جمال پاشا کے سلسلے میں مواد کی فراہمی کا مسئلہ ہمیشہ رہا۔ جبکہ پاشا کی ذاتی لائبریری اور پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہی اس کے لئے کافی تھے مگر ان کے وارثین نے پاشا کے ادبی ذخیرہ کو الماریوں کی زینت بنا کر مقفل کر دیا تا کہ کوئی اس کی دھول نہ

صاف کر سکے۔ پھر بھی ملک کی دیگر لائبریریاں کارآمد ثابت ہوئیں۔ اردو انشائیہ پر جو بھی کتابیں ملیں ان میں زیادہ تر کتابیں وزیر آغا گروپ کے لوگوں کی ہیں جنھوں نے ہندوستان میں انشائیہ کے وجود سے ہی انکار کیا۔ پھر بھی جو کچھ بھی بن پڑا اسے میں نے اپنی بحث کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں معاون و مددگار مانا۔ میں نے جو کوشش کی وہ آپ کے سامنے کتابی شکل میں حاضر ہے۔ یوں تو اردو انشائیہ کی بحث ایک معمہ ہے جس کا حل تلاش کرنے کے لئے انشائیہ اور مضمون کی بھول بھلیاں سے گذرنا لازمی ہے۔ میں نے اس کتاب کو ذاتی پسند کے اعتبار سے پانچ ابواب میں منقسم کیا ہے۔ جس میں پیش لفظ کے بعد پہلا باب اردو انشائیہ نگاری...... ایک تجزیہ کے عنوان سے ہے۔ جس میں ابتداء سے انشائیہ بحیثیت ایک ادبی اصطلاح تک اور پھر اس کے آغاز و ارتقاء پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ انشائیہ کے خدوخال کو متعین کرنے کے لئے مختلف ماہرینِ ادب اور ناقدین ادب کی آراء کو بطور دلیل پیش کر کے اعتدال کی راہ اپناتے ہوئے اردو انشائیہ کی خصوصیات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ باب کے آخر میں اردو انشائیہ نگاری کی روایت کو ابتداء سے لے کر احمد جمال پاشا تک کے انشائیہ نگاروں کے حوالوں کی روشنی میں پرکھنے کی سعی کی گئی ہے۔ جس میں خصوصی توجہ ۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک مرکوز کی گئی ہے۔ دوسرا باب احمد جمال پاشا.... شخصیت اور فن ہے جس میں احمد جمال پاشا کی پیدائش آباء و اجداد، گھریلو ماحول، بچپن کے شوق، طالب علمی کا زمانہ، ادبی سفر کی شروعات ان کی تخلیقات اور ان کی مختلف جہات شخصیت کو ذیلی عنوانات کے تحت پرکھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تا کہ ان کی شخصیت اور فن کی اصل تصویر قاری کے سامنے آسکے۔

تیسرا باب معاصرین احمد جمال پاشا ہے جس میں ان تمام مضمون نگاروں، طنز و مزاح نگاروں اور انشائیہ نگاروں کا ذکر ہے جنھوں نے غیر افسانوی نثر کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ موضوعات، زبان و بیان، غیر منطقی ربط اور اسلوب بیان کے حوالے سے انشائیہ نما تحریروں اور اہم انشائیوں کا بھی ذکر ہے اس طرح احمد جمال پاشا کے فن اور ہم عصروں میں ان کے مقام کے تعین میں کافی مدد مل سکتی ہے اس سے احمد جمال پاشا کے انشائیوں میں عصری آگہی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ چوتھا باب ''احمد جمال پاشا کی انشائیہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے ہے اس میں پاشا کی انشائیہ نگاری پر قدرے تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ انکے انشائیوں کے حوالے سے یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پاشا کے انشائیوں کی وہ کون کون سے خصوصیات ہیں جو ان کے انشائیہ کے فن کو معیاری بناتی ہے۔ تجزیاتی مطالعہ کے بعد انکشاف ذات، بے ربطی، شخصی ردِ عمل اور

موضوعات کا تنوع وغیرہ پاشا کے انشائیوں کے بنیادی اوصاف قرار پاتے ہیں۔" پانچواں باب ماحصل ہے جس میں حاصل مطالعہ کے طور پر اردو انشائیہ اور احمد جمال پاشا کی تفصیلی بحث کو بڑے ہی اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر میں کتابیات ہے جس میں اخبار و رسائل کی وہ فہرست ہے جس سے کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں براہ راست یا بالواسطہ استفادہ کیا گیا ہے جس کی تفصیل امدادی کتب کی فہرست کے طور پر پیش کر دی گئی ہے۔

کتاب کی تکمیل میں اولیت استاد محترم ڈاکٹر نصیر احمد خاں کو حاصل ہے جنھوں نے اردو انشائیہ کے رموز و امکانات سے ہمیں آشنا کرایا ان کے فیضان کے بغیر یہ کتاب اس معیار تک نہیں پہنچتی۔ بعد ازاں کچھ ایسی شخصیتیں ہیں جن کا شکریہ ادا کرنا میرا اخلاقی فرض ہے کیونکہ اردو انشائیہ اور احمد جمال پاشا دونوں ہی موضوع ایسے ہیں جس پر بہت کچھ مل پانا کارِ مشکل است لیکن میری اس مشکل کو جن لوگوں نے آسان کیا ان میں محترم اظہار احمد صاحب مدیر معلم اردو لکھنو، ڈاکٹر عبدالباری سلطانپور اور ڈاکٹر ظفر کمالی صاحب سیوان کے نام خصوصیت کے حامل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ دہلی اردو اکادمی کی لائبریری کے اسٹاف بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جنھوں نے میری تلاش کو تکمیل تک پہنچانے میں میری مدد کی۔ دوستوں میں میں ان تمام مخلص دوستوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے کتاب کی تکمیل سے متعلق تمام مشکلوں کو حل کرنے میں میرا ساتھ دیا۔ آخر میں اقرباء کا ذکر بھی ضروری ہے جن کا براہ راست تعلق اس کتاب سے تو بجا طور پر نہیں ہے لیکن اگر ان کا تعاون شاملِ حال نہ ہوتا تو میں شاید اتنی دلچسپی اور ذمہ داری یا سکون و اطمینان سے یہ کام نہ کر پاتا میری مراد برادرانِ خرد سید صادق رضا اور سید مہدی رضا سے ہے جنھوں نے مجھے گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد رکھا۔ والدین کی دعائیں بھی ساتھ ساتھ رہیں۔ میری دونوں بیٹیاں فردوس فاطمہ اور فرحت فاطمہ ابھی عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں انھیں انشائیہ اور ادب کی سمجھ نہیں ہے مگر انھیں اس بات کی خوشی ہے کہ ان کے پاپا کی کتاب چھپ رہی ہے میں دعا گو ہوں کہ وہ آگے چل کر اردو ادب کی تعلیم حاصل کریں اور یہ کتاب ان کے لئے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لے۔ آخر میں شریک حیات کا ممنون ہوں جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور ہر طرح سے میرا ساتھ دیا تاکہ میری یہ تخلیقی کاوش زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آ سکے۔ میں تمام حضرات کا ممنون و مشکور ہوں۔

سید معصوم رضا

نئی دلی۔110092

پہلا باب

اردو انشائیہ نگاری......ایک تجزیہ

اردو انشائیہ نگاری.........ایک تجزیہ

اردو زبان و ادب میں شاعری کا غلبہ ہر دور میں رہا ہے لیکن نثری ادب نے بھی شاعری کے شانہ بہ شانہ چلنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ شاعری میں غزل کو جو شہرت ملی وہ نثر میں کسی دوسری اصناف کو نہ مل سکی۔ غیر افسانوی نثر میں انشائیہ واحد صنف ہے جس کو غزل سے تشبیہ دی جاتی ہے کیونکہ دونوں میں اختصار، بے ربطی اور آزادی میں بھی ایک تسلسل پایا جاتا ہے لیکن اردو انشائیہ کا تجزیاتی مطالعہ قدرے تفصیل سے کیا جانا ابھی باقی ہے۔ میرا یہ مضمون اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں اردو انشائیہ کی گوناگوں تفصیلات کو اختصار کے ساتھ سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو میں انشائیہ کی بحث کا ایک طویل سلسلہ ہے جس کا احاطہ محدود دائرہ میں کرنا ممکن نہیں لیکن اردو انشائیہ کی روایت سے بحث کرتے وقت اس پر ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہو جاتا ہے۔ میں نے اس باب میں یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ اردو انشائیہ کے آغاز و ارتقاء کی داستان کیا ہے۔ اردو انشائیہ کی تعریف، اس کے خدوخال کیا ہیں اس کی خصوصیات کیا ہیں، امکانات کیا ہیں۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۹۰ء تک اردو انشائیہ کن کن نشیب و فراز سے گذرتا ہوا اپنی منزل مقصود کی طرف گامزن ہے۔ احمد جمال پاشا کے حوالے سے اردو انشائیہ کی بحث کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

ادب اور سماج ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ زمانے نے جب کبھی کروٹ بدلی ہے اور نئے نئے رجحانات کا چلن عام ہوا ہے تب سماج میں بھی تبدیلی ہوئی۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب بھی سماج میں کوئی تحریک چلی ہے اس نے ادب کو متاثر کیا ہے اور جب بھی ادب میں کوئی

تبدیلی ہوئی ہے سماج بھی بدلا ہے خواہ ۱۸۵۷ء کی پہلی تحریک آزادی ہو یا جنگ عظیم، سرسید تحریک ہو یا ترقی پسند تحریک، ہر تحریک نے انسان کو ذہنی اور جسمانی غلامی سے نجات دلانے کی کوشش کی ہے۔ آزاد ہندوستان کے ساتھ تقسیم ہند کا بھی مسئلہ رہا جس نے سماج اور معاشرے میں بے چینی، انتشار اور نفرت کو جنم دیا ساتھ ہی ادب میں نئے نئے موضوعات، کے انبار لگ گئے۔ ہیئت کے نئے نئے تجربے ہوئے اور اسی تگ و دو نے اردو انشائیہ کو توانائی بخشی۔ اردو انشائیہ آزادی کے چند سال قبل ہی وجود میں آیا اور رفتہ رفتہ اسے باضابطہ ایک صنف کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

ادب کی کوئی بھی صنف کبھی بھی ساکت نہیں ہوتی بلکہ اس میں وقت اور حالات کے مطابق تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے یعنی تمام اصناف ادب متحرک ہیں۔ زمانہ جیسے جیسے بدلتا جاتا ہے ادب کا مزاج بھی بدلتا جاتا ہے۔ نئے نئے انکشافات ابھرتے اور ڈوبتے رہتے ہیں۔ خواہ انشائیہ ہو یا ادب کی کوئی اور صنف یہ اچانک وجود میں نہیں آجاتی بلکہ اسکا خمیر معاشرے سے تیار ہوتا ہے۔ جب مخصوص طرزِ تحریر میں اپنے عہد اور حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے تو وہ کسی صنف کی حیثیت سے جانی اور پہچانی جاتی ہے۔ ہر عہد میں معاشرتی، تہذیبی، علمی اور فکری سطح پر رونما ہونے والے واقعات، افکار او انکشافات ہی دراصل ادب کی پیداوار کا سبب اور مختلف اصناف کی ایجاد کا باعث ہوتے ہیں ادیب اپنے عہد سے جدا نہیں ہوتا بلکہ وہ جس عہد میں سانس لیتا ہے اس کی مطابقت ماضی اور مستقبل سے استوار کرتا ہے جس میں ماضی کے دھندلکے اور مستقبل کا عکس صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ادب کا مقصد اصلاحِ معاشرہ ہے لیکن انشائیہ میں ادیب انکشاف ذات کو اظہار کا وسیلہ بناتا ہے اور اس کی تخلیق میں اس کے سماج و معاشرے کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ معاشرے کی بے چینی، بدعنوانی اور انتشار کے کرب کو محسوس کرکے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کو غیر رسمی انداز میں قلمبند کرنا ہی انشائیہ نگاری ہے۔

کچھ انشائیہ نگاری کے آغاز اور اردو میں اس کی نشو و نما کے بارے میں:

عالمی ادب میں انشائیہ کا موجد ڈی مونتین ہے جس نے فرانسیسی زبان میں اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر کچھ ایسی تحریریں چھوڑیں جو غیر رسمی اور شگفتہ تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ جس میں انکشافِ ذات بھی ہے اور موضوع کی تازہ کاری بھی۔ تحریر میں شوخی بھی ہے اور رنگارنگی بھی جسے

''ایسے'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جس کے لئے انشائیہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے فرانسیسی زبان سے یہ صنف انگریزی زبان میں منتقل ہوئی۔ انگریزی میں انشائیہ کا موجد بیکن ہے بیکن نے مونتین کی تحریروں کا ترجمہ کیا اور خود تخلیقی کارنامہ بھی انجام دیا۔ بیکن کی تحریروں میں مونتین کی کچھ خصوصیات ملتی ہیں۔ مگر اس کی تحریریں مکمل طور پر انشائیہ نہیں ہیں بلکہ یہ ہلکے پھلکے مضامین ہیں۔ جس میں مونتین کی تحریروں سے صرف غیر رسمی بیان کی حد تک مماثلث ہے۔ بیکن نے انگریزی ادب میں بیش بہا تحریریں چھوڑی ہیں مگر ان میں چند مشکوک نظروں سے دیکھی جاتی ہیں۔ جن کی بنیاد پر بیکن کو انگریزی ادب کا مونتین نہیں کہا جاسکتا۔ بعد میں چند دوسرے ادیبوں نے انگریزی میں مونتین کی روایت کو برقرار رکھا۔ جس کی آخری کڑی ایڈیسن اور اسٹیل ہیں۔ ایڈیسن اور اسٹیل نے انشائیہ کو کافی شہرت بخشی مگر ان کی تحریروں کو ''ایسے'' کہنا مناسب ہوگا کیونکہ انھوں نے ادب برائے مقصد کی پیروی کی اور ان کے تمام مضامین اصلاح معاشرہ کے لئے لکھے گئے ہیں جنھیں اصلاحی مضامین کہہ سکتے ہیں۔ مگر انشائیہ کہنا ممکن نہیں بلکہ انشائیہ نما تحریریں ہیں۔ ایڈیسن اور اسٹیل کے توسط سے اردو میں ایسے یعنی مضمون نگاری کی شروعات ہوئی۔ سرسید احمد خاں نے ''تہذیب الاخلاق'' انگریزی ایسے اور ایڈیسن و اسٹیل کے تتبع میں جاری کیا جو سرسید احمد خاں کی ایک سوچی سمجھی اور شعوری کوشش تھی۔ تہذیب الاخلاق کے اجراء کا واحد مقصد ہندوستانی مسلمانوں کی ترقی اور ان کو اپنے جدید رجحانات سے روشناس کرانا تھا۔ سرسید کے اس اقدام سے اردو میں ایسے کی شروعات ہوئی۔

دراصل لفظ ایسے (Essay) فرانسیسی لفظ (Essai) سے ماخوذ ہے۔ جس کے بارے میں یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ عربی کے لفظ ،، السعی ،، سے مستعار ہے۔ جس کے لغوی معنی سعی و کوشش کے ہیں۔ جس کا بیان تمام ماہرینِ ادب نے اپنے اپنے طور پر کیا ہے۔ اس لئے اس کی تفصیل بیان کرنا ضروری نہیں۔ انشائیہ کی اصطلاح جب انگریزی سے اردو میں مستعار لی گئی تو اردو میں پہلے اسکے لئے ''ایسے'' (Essay) کا لفظ استعمال کیا گیا جس میں زمانے اور وقت کے ساتھ نئے نئے امکانات رونما ہوتے گئے اور تحقیق و تنقید نے اس کے معیار کو متعین کرنا شروع کردیا جس کی بنیاد پر اسے ایسے کی ایک خاص صنف کی حیثیت سے تسلیم کیا جانے لگا۔ جسے لائٹ ایسے یا پرسنل ایسے بھی کہا جانے لگا۔ کہیں کہیں انشائیہ کو پیور پرسنل ایسے (Pure personal Essay) بھی کہا گیا ہے۔ ابتدا میں انشائیہ کیلئے لفظ ایسے کا استعمال ہی بعد میں انشائیہ کی شناخت کیلئے ایک مسئلہ بن کر رہ گیا اور وہ تمام تحریریں جو افسانوی ادب کے زمرے نہیں آتیں انہیں انشائیہ سمجھ لیا گیا۔ جس سے انشائیہ کی

تعریف میں کافی خلط ملط پیدا ہو گیا جس سے غلط فہمی پیدا ہو گئی جس کا سرسری جائزہ لینا بیجا نہ ہوگا۔ مضمون اور انشائیہ کے اصطلاح کی غلط فہمی کی روایت ڈاکٹر سیدہ جعفر کے یہاں سے شروع ہوئی جنہوں نے ۱۹۵۸ء میں اپنا تحقیقی مقالہ ''اردو مضمون کا ارتقاء'' جمع کیا جو بعد میں کتابی شکل میں سامنے آیا۔اس کے دیباچہ میں کچھ اس طرح سے رقم طراز ہیں ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

''ابتداء میں میرا خیال یہ تھا کہ جس طرح انگریزی میں ''ایسے'' کی اصطلاح مختلف ادبی، سیاسی، تاریخی، اور سماجی موضوعات کے لئے یکساں طور پر مستعمل ہے اسی طرح ہم اردو میں انشائیہ کی اصطلاح ہر قسم کے مضامین کیلئے استعمال کر سکتے ہیں چنانچہ میں نے اپنے مقالہ میں ''ایسے (Essay)'' کیلئے انشائیہ کی اصطلاح برتی تھی۔''(۱)

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے اپنی کتاب اردو ایسیز (Essays) میں سیدہ جعفر کے مقالہ نگاری پر۔ پی ایچ ڈی کرنے کا ذکر کیا ہے اور انہیں ادیب علی گڑھ کے انشائیہ نمبر کی مرتب بتایا ہے جب کہ ادیب انشائیہ نمبر کے ایڈیٹر ڈاکٹر قمر رئیس کا ماننا ہے کہ محترمہ نے چار پانچ سال یعنی ۱۹۵۸ء تک اردو انشائیہ کے حسب و نسب تلاش کئے ہیں۔ان تین لوگوں نے اس سیدھے سے مضمون اور انشائیہ کے فرق کو ابہام کوئی کی روایت بنا دی اور یہ تین طرح کے بیانات ہی انشائیہ کی اصطلاح کے لئے کثرت تعبیر خواب ہیں۔ڈاکٹر صفی مرتضیٰ نے ''اردو انشائیہ'' کے نام سے ایک مضامین کا مجموعہ مرتب کیا ہے جس میں انشائیہ کے جواز میں سیر حاصل تبصرہ اور بحث ''اردو ایسے'' سے کی گئی ہے جو غلط فہمی کے سلسلے کے بیچ کی کڑی ہے لکھتے ہیں۔

''انشائیہ لفظ خالص اردو لفظ ہے اور لفظ مضمون کے لغوی معنی سے کوئی مغائرت نہیں رکھتا''۔(۲)

ڈاکٹر سلام سندیلوی نے بھی اپنی کتاب ''ادب کا تنقیدی مطالعہ'' میں انشائیہ اور مضمون پر تفصیلی بحث کی ہے اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ انشائیہ اور مضمون دو الگ الگ صنف کی حیثیت سے تسلیم کئے جا چکے ہیں مگر ایک جگہ وہ پھر اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے:

''انشائیہ کا مفہوم اردو ادب میں تقریباً وہی ہے جو انگریزی میں Essay کا ہے۔لغوی اعتبار سے ''ایسے'' کا مفہوم ہے''۔(۳)

شروع میں اسی طرح کی تحریروں نے انشائیہ کی اصطلاح میں غلط فہمیاں پیدا کر دیں جب

کہ انشائیہ اور مضمون یا ایسے کا واضح تصور ناقدین کے ذہن میں موجود تھا مگر کہیں کہیں وہ وقت کی دھار میں بہہ کر انشائیہ اور ایسے کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔اردو میں انگریزی کی حمایت کرنے والوں میں کلیم الدین احمد کا نام سرفہرست آتا ہے جنہوں نے مغربی تنقید کی جولانیوں کو دیکھا تو اردو تنقید کا وجود ہی سرے سے ختم کر دیا مگر جب اردو انشائیہ کے بارے میں کچھ کہنے کی باری آئی تو بہت ہی کم سخن ہو گئے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اس بحث میں پڑ کر مزید اس کو الجھانے سے احتراض کیا' لکھتے ہیں:

''انشائیہ کوئی نئی صنف نہیں ہے یہ در اصل Essay ہے اس میں Essay کی تمام جملہ خصوصیات موجود ہیں''۔(۴)

ایک ناقد اور ماہر ادب کی یہ دو سطر کی بحث عجیب بات لگتی ہے ایک عام قاری بھی انشائیہ کے مسئلہ سے آشنا ہو کر یہ بیان بڑی آسانی سے دے سکتا ہے لیکن انشائیہ اور ایسے کے گڈمڈ ہونے میں ایسی تعریفوں کا تعاون رہا ہے۔ڈاکٹر اطہر پرویز بھی انشائیہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

''انشائیہ انگریزی لفظ (Essay) ایسے کے معنی میں ہیں اور اس کے لئے اب تک اردو میں جو لفظ استعمال کئے گئے ہیں ان میں قریب ترین یہی لفظ ہے۔''(۵)

احمد جمال پاشا اپنے مضمون ''انشائیہ کی اصطلاح'' میں اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اردو ادب میں انشائیہ کی تحریک بیسوی صدی کی پانچویں دہائی میں جب شروع ہوئی تو لفظ انشائیہ اتنا زیادہ پسند کیا گیا کہ ''مضمون کیلئے ''انشائیہ'' کی اصطلاح استعمال کی جانے لگی اور انشائیہ کے فنی امتیاز اور تکنیک کا خیال کئے بغیر اہل نقد نے مضمون کے سر پر انشائیہ کا سہرا باندھ دیا''۔(۶)

اس مضمون میں وہ خود بھی اس طرح کی غلطی کر بیٹھے ہیں انہوں نے چند حضرات کے مضامین کے مجموعوں کی ایک طویل فہرست بتائی جس میں مضامین ماسٹر رام چندر مضامین سرسید، مضامین شبلی، مضامین پطرس، مضامین رشید تو بجا ہیں مگر ان کے ساتھ ہی ساتھ مضامین محمد حسین آزاد (نیرنگ خیال) مضامین خواجہ حسن نظامی (سیپارۂ دل) مضامین نیاز فتحپوری (نگارستان)

اور مضامین یلدرم (خیالستان) وغیرہ کو خود بہ خود مضامین گردان کر احمد جمال پاشا نے متذکرہ تمام روایتوں کو قائم رکھا ہے جبکہ سیپارۂ دل، نیرنگ خیال وغیرہ کے بارے میں ابھی ناقدین میں اختلاف رائے ہے کہ یہ مضامین ہیں یا انشائیے۔ یہ تمام غلط فہمیاں انگریزی سے لفظ ''ایسے'' مستعار لینے کی وجہ سے ہوئیں۔ اکثر و بیشتر ناقدین و ماہرین ادب انشائیہ کی تعریف میں جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ مضمون سے بالکل الگ ہے مگر جب انشائیہ کے انتخاب کی بات آتی ہے تو وہ انشائیہ کو مدِ نظر نہیں رکھتے بلکہ وہ مسئلے کو اور الجھا دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے ایک خاکہ بنا کر اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے لکھتے ہیں:

> ''یہ دیکھنے کے لئے کہ انشائیہ مضمون نگاری کی روایت سے کس حد تک جدا ہے میں نے ایک مختصر سا شجرہ مرتب کیا ہے مجھے یقین ہے کہ اس کے غائر مطالعے سے بات آئینہ ہو جائیگی۔'' (۷)

ادب

نثر — شاعری

نثر: داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ، سوانح عمری، سفرنامہ، انشائیہ، مضمون

مضمون: طنزیہ مضمون، مزاحیہ مضمون، تنقیدی مضمون، علمی مضمون، تحقیقی مضمون
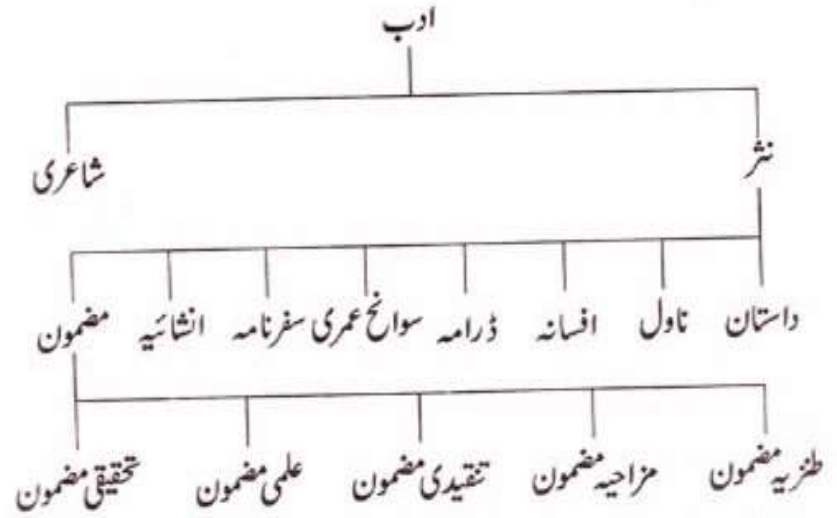
درج بالا شجرہ میں ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ اور مضمون کے اس خلط ملط بحث کو کافی حد تک واضح کر دیا۔ انشائیہ کو جب باضابطہ صنفی حیثیت حاصل ہو گئی تو لوگوں نے اس کی جڑیں تلاش کرنی

شروع کر دیں۔ کسی نے انشائیہ کی جڑوں کا سراغ عظیم آباد میں لگایا تو کوئی اسے پاکستان گھسیٹ کر لے جانے کی فکر میں مسلسل دعوے اور ثبوت پیش کرتا رہا۔ ان دونوں نے ابھی اپنا بیان مکمل نہیں کیا تھا کہ تیسرا دعویدار انشائیہ کو دکن کی دین بتانے لگا اس کو دیکھ کر کچھ اور دعویدار اپنے بے بنیاد دعوے کو لیکر میدان میں کود پڑے یہ بھی ایک دلچسپ بحث ہے جس کا سلسلہ انشائیہ کے آغاز و ارتقاء سے اب تک چلا آ رہا ہے۔ اس بحث سے بہت سے انکشافات اور امکانات بھی رونما ہوئے۔ پھر بھی یہ بات ابھی تک زیرِ بحث ہے کہ ''انشائیہ'' کا موجد کون ہے۔ پہلا انشائیہ نگار کون ہے اور انشائیہ کا پہلا مجموعہ کس کو قرار دیا جائے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان تمام تحریروں پر سرسری نظر ڈال کر چند دلائل کا انتخاب کر کے اس مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کی جائے۔ اردو انشائیہ کے وجود میں آنے کا سبب بھی دیگر اصناف سخن کی طرح ہے اس کے پسِ منظر میں وہ تمام محرکات و عوامل کارفرما ہیں۔ اردو انشائیہ کے بارے میں اب تک کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکی ہے۔

اردو انشائیہ کی ابتداء کے سلسلے میں مختلف نظریات ملتے ہیں جس میں کچھ تو جذبات کی رو میں بہہ جانے کا نتیجہ ہیں لیکن کچھ دلائل پر مبنی ہیں اور اس کا جواب بھی اسی دلیل میں موجود ہے۔ عام طور سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ اردو انشائیہ اور اردو مضمون میں کافی مماثلت ہے اس کی چند مشترک خوبیاں بھی ہیں مگر بعد میں لوگوں نے اس کی شناخت کے لئے نام میں کچھ ترمیم و اضافے کیے تا کہ مضمون اور انشائیہ کا فرق واضح ہو جائے۔ انگریزی میں مضمون کیلئے ''ایسے'' کی اصطلاح رائج ہے جس کی بنیاد پر اردو انشائیہ کو ''لائٹ ایسے'' پرسنل ایسے یا پیور پرسنل ایسے کے مترادف قرار دیا گیا۔ دلائل یہ پیش کیے گئے کہ اردو انشائیہ میں چونکہ غیر رسمی انداز تحریر ہوتا ہے۔ بے تکلفی اور بے ربطی ہوتی ہے اس لئے یہ سنجیدہ مضمون کے زمرے میں نہیں آ سکتا اس لئے ہم اسے ہلکے پھلکے مضمون کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ یہ تمام اصطلاحیں انشائیہ کے باضابطہ وجود میں آنے کے بعد کی دین ہیں۔ ابتداء میں کچھ تحریریں ملتی ہیں مگر ان کے فنی محاسن کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ بعد میں اس صنف کے باضابطہ وجود میں آنے کے بعد اس کی تلاش و تحقیق شروع ہوئی۔ انشائیہ کا حسب و نسب انگریزی ''ایسے'' سے جا ملتا ہے اس لئے محققین و ماہرین ادب یا ناقدین ادب نے انشائیہ کی تلاش اردو مضمون نگاری سے شروع کی اور ابتداء میں بغیر کسی جھجک کے بلاشبہ اردو انشائیہ کا موجد سر سید احمد خاں کو بتایا۔ یہ دلیل بالکل ویسی ہی ہے جیسے اردو مضمون کو بھی اردو انشائیہ کہا گیا۔ یہاں تک تو بات عقل و شعور کی معلوم ہوتی ہے کہ سر سید احمد خاں کو اردو انشائیہ کا موجد قرار دیا گیا مگر اس پر بھی اکتفا

نہیں کی گئی بلکہ اردو نثر کے ابتدائی نقوش جہاں ملتے ہیں وہیں سے انشائیہ کی تلاش وجستجو شروع کی گئی اس تلاش وجستجو میں ڈاکٹر جاوید وششٹ نے بھی اردو انشائیہ کی ابتداء کے سلسلے میں کچھ معروضات کے اضافے کئے۔ ملاحظہ ہو ان کی کتاب ''ملا وجہی کے انشائیے'' سے دو اقتباس:۔

''ملا وجہی عالمی ادب کے پہلے انشائیہ نگار مون ٹین اور انگلش ایسے کے موجد بیکن کا ہم عصر تھا اور عالمی سطح پر بھی ملا وجہی کا تیسرا نمبر تھا۔'' (۸)

''ان حقائق کی روشنی میں ملا وجہی کو اردو انشائیہ کا موجد اور باوا آدم قرار دیتا ہوں اور اس کے ان اکسٹھ انشائیوں کو اردو کے پہلے انشائیے'' (۹)

درج بالا دونوں اقتباسات کی تحقیق وتصدیق جاوید وششٹ نے ۱۹۷۲ء میں کی۔ اس سے صرف ایک یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ ملا وجہی کس دور کے نثر نگار تھے۔ ان سے قبل ملا وجہی کے 'سب رس'' کو مولوی عبدالحق نے ایک بصیرت آمیز مقدمہ کے ساتھ شائع کرایا تھا۔ وہ ایک معتبر محقق تھے مگر انھوں نے اس طرح کی غلطی نہیں کی جس کا ذکر ڈاکٹر جاوید وششٹ نے کیا ہے۔ قصۂ حسن ودل کے کچھ حصے کو انشائیہ کہہ دینا ان کی بھول ہے بلکہ یہ انشا پردازی کے اچھے نمونے ہیں ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بھی انھیں انشائیہ نما تحریریں قرار دی ہیں انشائیہ کے موجد کے سلسلے میں ایک ذیلی بحث ملتی ہے جس کی تردید بھی ڈاکٹر جاوید وششٹ نے کر دی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے مطابق غالباً اردو میں انشائیہ کا لفظ مہدی حسن نے پہلی بار استعمال کیا ہے۔'' مگر یہ تذبذب والی بات ہے خود ڈاکٹر وحید قریشی نے غالباً کا لفظ استعمال کر کے اس کی پائیداری کو مشکوک کر دیا ہے۔ دوسری طرف ڈاکٹر جاوید وششٹ نے یہ ثابت کیا ہے کہ مہدی حسن نے اردو انشائیہ کا لفظ ہی استعمال نہیں کیا۔ انشائیہ کی اس ذیلی بحث کے علاوہ کچھ بحثیں ایسی ہیں جنھیں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور ان میں دو نام مخصوص ہیں جن سے اردو ادب کا قاری بہ خوبی متعارف ہے۔ ان کے اسمائے گرامی ہیں ڈاکٹر محمد حسنین اور ڈاکٹر وزیر آغا یہ دونوں نام اس ضمن میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی تفصیلی بحث سے دیگر ماہرین ادب نے کافی استفادہ کیا اور ضمنی بحثیں بھی چھیڑیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ کی تحریک چلائی اور خود قافلہ سالار بن بیٹھے۔ ان کے گروپ میں ڈاکٹر انور سدید، غلام الثقلین نقوی، صلاح الدین احمد، احمد جمال پاشا، پروفیسر جمیل آزر اور اکبر حمیدی وغیرہ نے اندھی تقلید کر کے ڈاکٹر وزیر آغا کو اردو انشائیہ کا موجد قرار دینے کی کوشش میں کوئی بھی کسر باقی نہ رکھی۔ مگر ان کے مقالے اور مضمون (جو وزیر آغا کی حمایت میں لکھے گئے ہیں نہ کہ اردو انشائیہ کی تحقیق میں) ہی میں اس کا

جواب بھی موجود ہے کہ اردو انشائیہ کے موجد ڈاکٹر وزیر آغا نہیں بلکہ کوئی دوسرا ہے۔ دوسری طرف ڈاکٹر محمد حسنین نے ڈاکٹر اختر اورینوی کو اردو انشائیہ کا موجد قرار دیا ہے جبکہ وزیر آغا نے خود کو کئی بار انشائیہ کا موجد کہا اور لوگوں سے بھی کہلوانے کی کوششیں کیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے یہاں خود پرستی کا چلن نظر آتا ہے۔ وہ اپنے علاوہ کسی کو پہلا انشائیہ نگار ماننے کے لئے تیار ہی نہیں ہے اگر وہ کسی کو تسلیم بھی کرتے ہیں تو آدھا ادھورا۔ ان کا بھی حال پروفیسر کلیم الدین احمد کا سا ہے۔ (جس سے اردو ادب کے قاری بخوبی واقف ہیں)۔

پہلی بار لفظ انشائیہ ۱۹۴۵ء میں منظر عام پر آیا تو دیگر ماہرین ادب نے اپنے حوالے سے اس کا نام کرن کرنا شروع کر دیا۔ اختر اورینوی نے سید علی اکبر قاصد کے انشائیوں کے مجموعہ ''ترنگ'' (پٹنہ ۱۹۴۵ء) میں انشائیہ نگاری کے عنوان سے دیباچہ لکھ کر انشائیہ کو باضابطہ طور پر متعارف کرایا۔ دیباچہ میں وہ یوں رقم طراز ہیں:

''اردو ادب میں انشائیوں (Essays) اور خاکوں کی بڑی کمی ہے۔ کبھی کبھار کوئی اچھا سا انشائیہ پرچوں میں نکل آتا تو دو گھڑی کے لئے جی بہل جاتا۔ انشائیہ نگاری مضمون نویسی کی ایک خاص صنف ہے'' (۱۰)

لفظ انشائیہ کو غیر افسانوی ادب میں ایک خاص صنف کی حیثیت سے متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ اس بات کی وضاحت بھی اختر اورینوی نے کی ہے کہ انشائیہ نگاری، مضمون نگاری کی ایک خاص صنف ہے اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انشائیہ کا واضح تصور ان کے ذہن میں تھا انھیں مضمون اور انشائیہ میں فرق کرنے کی بھی تمیز تھی۔ اختر اورینوی کی اس روایت کو محمد حسنین نے اپنی کتاب ''صنف انشائیہ اور چند انشائیے'' لکھ کر آگے بڑھایا جو پہلی بار اگست ۱۹۵۸ء میں کتابی شکل میں منظر عام پر آئی۔ محمد حسنین نے اپنی اس کتاب میں فن انشائیہ پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس کی وضاحت بھی کی ہے یہ ان کی تنقیدی صلاحیت اور تحقیقی کاوش کا عمدہ نمونہ ہے۔ جس سے فن انشائیہ کی بہت سی بکھری ہوئی تفصیلات سمٹ کر یکجا ہو گئی ہیں۔ محمد حسنین نے نہ صرف لفظ انشائیہ اور فن انشائیہ کے اختراع کا سہرا اختر اورینوی کے سر باندھا ہے بلکہ صاف لفظوں میں اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ سید علی اکبر قاصد ہی اردو کے پہلے باقاعدہ انشائیہ نگار ہیں اور انشائیوں کا پہلا مجموعہ ''ترنگ'' ہے محمد حسنین لکھتے ہیں۔

''سید شاہ علی اکبر قاصد مرحوم متوطن پھلواری شریف' پٹنہ اس لحاظ سے

اردو کے پہلے انشائیہ نگار ہیں کہ انہوں نے انشائیہ کے نام اور اس اسلوب کے واضح تصور کے پیشِ نظر اپنا قلم اٹھایا۔۔۔ ''ترنگ'' ان کے انشائیوں کا مختصر مجموعہ ہے جو ۱۹۴۵ء میں پٹنہ سے شائع ہوا تھا۔ ترنگ کے مقدمہ میں ڈاکٹر اختر اورینوی نے اس نثری اسلوب کو انشائیہ سے نامزد کیا تھا۔ لفظ انشائیہ ان کی ایجاد نہیں مگر اس نوع کی تحریروں کی نامزدگی میں زبان پر اختر اورینوی کا نام بے ساختہ آئے گا۔'' (۱۱)

درج بالا اقتباس کی اشاعت ۱۹۷۲ء میں ہو چکی تھی اس کے قبل اختر اورینوی کا انشائیہ نگاری پر ایک مقالہ کراچی (پاکستان) کے رسالہ مہر نیم روز کے اختر اورینوی نمبر میں شائع ہو چکا تھا۔ جس میں اردو انشائیہ کے سمت کا تعین ہوا اور اردو میں باضابطہ انشائیہ نگاری اور انشائیہ کے فن پر بحث و مباحثے کے ساتھ ساتھ اس سے متعلق مضامین بھی منظرِ عام پر آنے لگے تھے کہ اچانک اردو انشائیہ کی ازسرنو تحقیق کی جانے لگی۔ تمام تخلیقی سرمایے کی صنفی حیثیت سے انکار کیا جانے لگا اردو ادب کی اصناف کی طرح انشائیہ کی داغ بیل بھی ہندوستان میں پڑی اور پرورش و پرداخت کا ٹھیکہ صرف اور صرف پاکستان نے لے لیا۔ جس قافلے نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا اسکے قافلہ سالار ڈاکٹر وزیر آغا ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں پٹنہ سے ترنگ کی اشاعت کے کافی عرصہ بعد ۱۹۸۹ء میں ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ مضمون منظرِ عام پر آیا جس میں لکھتے ہیں:

چونکہ ''ایسے (Essay)'' کے لفظ نے خود مغرب میں بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دیا تھا۔ جنہیں ہمارے انگریزی پڑھانے والوں نے وراثت میں حاصل کیا تھا۔ لہٰذا میں چاہتا تھا کہ پرسنل یا لائٹ ایسے کیلئے کوئی نیا اور منفرد اردو نام تجویز کیا جائے۔ انہیں دنوں میں نے بھارت کے کسی رسالے میں انشائیہ کا لفظ پڑھا اور مجھے یہ اتنا اچھا لگا کہ میں نے مرزا ادیب صاحب جو ان دنوں ادب لطیف کے مدیر تھے۔ اس نام کو پرسنل ایسے کیلئے مختص کرنے کی تجویز پیش کر دی جسے انہوں نے فوراً قبول کر لیا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ مجھ سے پہلے ڈاکٹر محمد حسنین انشائیہ کا لفظ لائٹ ایسے کیلئے استعمال کر چکے تھے مگر جن لائٹ ایسے کیلئے انہوں نے یہ لفظ استعمال کیا تھا وہ سرے سے لائٹ ایسے تھے ہی نہیں''۔ (۱۲)

اسی بات کو نظیر بنا کر غلام الثقلین نقوی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

''انگریزی کے لائٹ ایسے کے طرز کے چند مضمون ڈاکٹر وزیر آغا کے چھپ چکے تھے۔ اس صنفِ ادب کے لئے اردو میں مناسب لفظ کی تلاش تھی۔ ادب پارہ، انشائے لطیف اور تمک پارہ کی اصطلاحیں بحث کا موضوع تھیں۔ کچھ دنوں کے بعد ڈاکٹر وزیر آغا کی طرف سے انشائیہ کی اصطلاح تجویز ہوئی۔ اسے اہلِ قلم نے کچھ عرصہ بحث و تمحیص کے بعد نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اپنا لیا۔'' (۱۳)

ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک مضمون ''انشائیہ کیا ہے'' اوراق لاہور اور ہماری زبان دہلی ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا جو بعد میں انکی کتاب ''انشائیہ کے خدوخال'' میں بھی شامل ہے لیکن اس میں انہوں نے چند جملے تبدیل کر دیے ہیں۔ دونوں میں الگ الگ وہ لکھتے ہیں کہ اردو انشائیہ نگاری پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد شروع ہوئی اس لئے یہ پاکستان کی دین ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ جب تک زبان ارتقائی مراحل میں ہوتی ہے کوئی تخلیق یا صنف وجود میں نہیں آتی نہ ہی اس میں اتنی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ کسی صنف کو پیدا کر سکے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی اس رائے کے مطابق تقسیم ہند سے قبل اردو زبان اپنے ارتقائی مراحل طے کر رہی تھی اس لئے انشائیہ کا وجود میں آنا ممکن نہ تھا جبکہ اردو ادب میں جو کچھ بھی بیش بہا اور گراں قدر ذخیرے موجود ہیں وہ سب آزادی کے قبل ہی کی تخلیق ہے۔ وزیر آغا کے مطابق اگر غور کیا جائے تو شاعری میں میر، سودا، غالب، انیس، اقبال اور جوش وغیرہ اور نثر میں ملا وجہی، رجب علی بیگ سرور، رتن ناتھ سرشار، رسوا، سرسید، شبلی، یلدرم، حالی، پریم چندر، کرشن چندر اور پطرس بخاری وغیرہ جو ہندوستان میں پیدا ہوئے وہ قبل از وقت پیدا ہو گئے کیونکہ اردو میں میر، اور میر امن اس وقت پیدا ہوئے جب زبان اپنے ارتقائی مراحل سے گزر رہی تھی اور فارسی کے غلبے سے اسے گلی کوچوں اور بازار کی زبان کہا جاتا تھا۔ یا تو وزیر آغا کے مطابق یہ بھی حضرات شاعر یا نثر نگار ہی نہ تھے یا اگر یہ پاکستان میں پیدا ہوتے تو شاید میر، میر نہ ہوتے اور میر امن بھی میر امن نہ ہوتے۔ ایک بات اور قابلِ غور ہے کہ کیا پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد اردو میں جو استعداد پیدا ہوئی اس کی دین صرف اور صرف انشائیہ ہی ہے۔ لیکن اردو زبان یا اردو ادب صرف انشائیہ ہی نہیں ہے بلکہ اور بھی کچھ ہے مگر دوسرے صنف میں پاکستان نے غالب اور میر کیوں نہیں پیدا کئے جب کہ انشائیہ کے خود ساختہ موجد وزیر آغا ہیں اور انشائیہ کا جنم پاکستان میں ہوا۔ مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی یہ دلیل قابلِ قبول نہیں ان کی انشائیہ کے متعلق رائے بھی قابلِ اعتبار نہیں اس

لئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ انشائیہ اس دور میں پیدا ہوا جب زبان اپنے ارتقائی مراحل سے گزر کر باضابطہ ادب کے زمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ زبان میں استعداد پیدا ہو چکی تھی کہ دوسری اصناف نظم ونثر کو پیدا کر سکے تبھی اسی سلسلے کی آخری کڑی کے طور پر ایسے کے بعد اردو انشائیہ کا وجود عمل میں آیا ملاحظہ ہو ڈاکٹر وزیر آغا کی وہ رائے جس کے طفیل میں متذکرہ بالا صفحات پر بحث کی گئی ہے۔

''اردو انشائیہ نگاری پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد شروع ہوئی اور اس کی کئی وجوہ تھیں۔ مثلاً ایک یہ کہ انشائیہ نویسی کی روش اس وقت وجود میں آتی ہے جب زبان ارتقاء کے بعض مراحل طے کر لیتی ہے پچھلے تیس سالوں میں اردو نثر میں جو بے پناہ ترقی ہوئی ہے اور اس میں لطیف کیفیات اور مفاہیم کو گرفت میں لینے کی جو استعداد پیدا ہوئی ہے وہی انشائیہ کے فروغ کا اصل سبب ہے۔''(۱۴)

اسی مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

''لوگ باگ اکثر وبیشتر اس بات کا تقاضہ کرتے ہیں کہ انشائیہ کی کوئی ایسی تعریف Definition مہیا کی جائے جو اس کے مزاج اور جہت کو پوری طرح بے نقاب کر دے اور میں نے ہمیشہ یہ موقف اختیار کیا ہے کہ انشائیہ کی آزادہ روی کسی تعریف کی متحمل نہیں ہو سکتی تاہم چونکہ شدت آگئی ہے اس لئے میں فسادِ خلق کے پیشِ نظر انشائیہ کی جسارت پیش کرتا ہوں۔''(۱۵)

ڈاکٹر وزیر آغا جنہوں نے خود کو انشائیہ کا موجد منوانے کیلئے تمام حربوں کا استعمال کیا سرے سے ہندوستان میں اردو انشائیہ کی تردید کرتے ہیں۔ بقول وزیر آغا اُن سے قبل انشائیہ کی نہ کسی نے تحریک چلائی نہ انشائیہ کے فن کو فروغ دیا۔ انشائیہ نگاری کی شروعات کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''جب ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ اردو انشائیہ اپنے بھرپور انداز میں ابھر کر سامنے آیا اور اردو انشائیوں کا پہلا مجموعہ بھی شائع ہو گیا تو پوری اردو دنیا میں انشائیہ کی جڑوں کی تلاش کا سلسلہ فی الفور شروع کر دیا گیا۔''(۱۶)

جمیل آزر نے اپنی کتاب ''اردو کا بہترین انشائی ادب'' میں وزیر آغا اور ان کی کتاب خیال پارے کے اولیت کا ذکر کیا ہے انور سدید نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ احمد جمال پاشا نے اپنے مضمون 'انشائیہ کی اصطلاح'' میں ڈاکٹر وزیر آغا اور ان کے مجموعے کی اولیت پر یوں اظہار

خیال کیا ہے۔''

''ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کا مجموعہ ''خیال پارے'' اردو ادب میں نہ صرف انشائیوں کا اولین مجموعہ ہے بلکہ اردو ادب میں اس کی اشاعت سے انشائیہ کی اصطلاح رائج ہوئی ہے۔''(۱۷)

دوسری طرف احمد جمال پاشا ڈاکٹر محمد حسنین کی کتاب ''صنف انشائیہ اور انشائیے'' کے بارے میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس میں انشائیہ کی تنقید اعلیٰ کافی کارآمد ہے اور اس کے انتخاب کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ اس میں کچھ انشائیے بھی ہیں اس لئے تاریخی اعتبار سے سید محمد حسنین نے انشائیہ کو ڈاکٹر وزیر آغا سے پہلے منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی۔ انشائیہ کی تحریک اور روایت کو آگے بڑھایا ملاحظہ فرمائیں احمد جمال پاشا کا خیال:

''صنف انشائیہ اور انشائیے'' ڈاکٹر سید محمد حسنین کے مقدمے کا بیشتر حصہ انشائیے کی تنقید سے متعلق اور گراں مایہ ہے مگر ان کے انتخاب میں مضامین بھی شامل ہیں اور انشائیے بھی''۔(۱۸)

اردو انشائیہ نگاری کے بارے میں جو بھی غلط فہمیاں عام ہوئیں ہیں اس کا سہرا ڈاکٹر وزیر آغا اور ان کے گروپ کے سر ہے۔ سرے سے انشائیہ اور انشائیہ نگاری کے وجود سے انکار کرنا اور خود کو موجد قرار دینا۔ انشائیہ نگاری کی شروعات ۱۹۶۰ء میں خیال پارے کی اشاعت کے بعد تسلیم کرنا جب کہ اس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے کہ اختر اورینوی نے انشائیہ کو اردو ادب میں سب سے پہلے متعارف کرایا اور سید علی اکبر قاصد کا مجموعہ ''ترنگ'' انشائیوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر محمد حسنین نے لائٹ ایسے یا پرسنل سے جو بحث کی ہے ڈاکٹر وزیر آغا اسکا بھی اعتراف کرتے ہیں مگر ان کے انتخاب کو وہ تسلیم نہیں کرتے جس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس وقت تک ڈاکٹر وزیر آغا کا کوئی مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آیا تھا۔ اس لئے انشائیہ کے محرکات پاکستان میں ۱۹۶۰ء کے قریب پہلی بار ملے۔ یہ سراسر اندھیر نگری والی بات ہے اکثر وبیشتر مبہم الفاظ میں خود کو انشائیہ کا بہت بڑا خدمت گار کہلوانا مثلاً لوگ باگ، قابل ادیب اور انیسویں صدی میں اردو انشائیہ جیسی بے بنیاد اور غیر مستند مثال دیگر مقالے کی پائیداری پر سوالیہ نشان چھوڑ دیتے ہیں۔ اردو انشائیہ کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کے خیالات میں جو بے راہ روی اور غلط فہمی ہے اس کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر نصیر احمد خاں لکھتے ہیں:

''وزیر آغا نے انشائیے کے فن اور تکنیک سے بحث کرتے ہوئے اردو

انشائیے کو بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کی پیداوار کہا ہے اس معاملہ میں وہ بہت
آدرش پرست ہو گئے ہیں پتہ نہیں ان کے پاس انشائیہ کے فنی محاسن کہاں سے
آئے ہیں اگر یہ خودان کی ایجاد ہے تو ان کے تینوں مجموعوں ''خیال پارے'' چوری
سے یاری تک'' اور'' دوسرا کنارہ'' کا ایک بھی انشائیہ اپنی تمام نزاکتوں اور
لطافتوں کے ساتھ ان فنی تقاضوں پر پورا کیوں نہیں اترتا جنھیں انہوں نے
انشائیہ کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔''(۱۹)

اسکا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے کہ اردو میں لفظ انشائیہ تقسیم ہند کے قبل مستعمل
تھا۔''ترنگ'' کو انشائیوں کا پہلا مجموعہ بھی قرار دیا جا چکا تھا مگر ڈاکٹر وزیر آغا نے بیسویں صدی کی
پانچویں دہائی سے از سرنو انشائیہ کی تحقیق کا سلسلہ شروع کیا اور طرح طرح کے بیانات سے اردو کو مالا
مال کیا خواہ وہ غلط بیانی ہو یا حقیقت بیانی مگر ۱۹۸۹ء میں انہوں نے ایک مضمون ''اردو انشائیہ کی
کہانی'' میں دو ایسے انکشافات کا ذکر کیا ہے جس سے خودان کے ہی قلم سے انشائیہ لائٹ ایسے اور
اس سے متعلق دیگر مسائل کے حل سامنے آجاتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء سے انشائیہ کی از سرنو تحقیق کی
شروعات کے قبل ہی اس بات کا انکشاف وزیر آغا کو کرنا چاہیے تھا لیکن کافی عرصہ بعد وہ اس بات
کا اعتراف بھی کرتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ اس کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

پچھلے دنوں اس سلسلے میں دو انکشافات ہوئے ایک تو یہ کہ تقسیم سے پہلے
علی اکبر قاصد کے مضامین کا مجموعہ ''ترنگ'' کے دیباچہ میں اختر اورینوی نے
انشائیہ کا لفظ استعمال کیا اور اس سے مراد پرسنل یا لائٹ ایسے ہی تھی لیکن خود علی اکبر
قاصد کے مضامین کا انشائیہ سے دور کا واسطہ نہیں تھا گویا اختر اورینوی کے تجویز
کردہ لفظ کیلئے اردو میں انشائیہ جیسی تحریر بطور مثال موجود نہ تھی لہذا ان کے زمانے
میں اس لفظ کو قبول نہ کیا گیا۔''(۲۰)

ڈاکٹر وزیر آغا کے متذکرہ بالا اقتباس کو مدنظر رکھ کر ہم احمد جمال پاشا کے
درج ذیل اقتباس کی تردید کر سکتے ہیں۔

'' Light, Pure, Personal Essay یا انشائیہ اردو میں قطعی نووارد صنف
ادب ہے جس کی ابتدا ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں اور ان کی تحریک سے ہوئی
اسلئے وہ تمام اہل نقد جو انشائیہ کو مضمون، طنزیہ، مزاحیہ، مضمون خاکے یا مضمون نما

افسانوں سے مراد لیتے ہیں اور بلا تکلف اس کا سلسلہ ملا وجہی، ماسٹر رام چندر، طلسم
ہوشربا، فورٹ ولیم کالج، مرزا غالب، سرسید اور آزاد سے ملا دیتے ہیں اور اس قسم
کے سوالات اٹھاتے ہیں کہ انشائیہ کی اصطلاح سب سے پہلے مہدی حسن یا
اختر اورینوی نے استعمال کی تھی، انکے ذہن میں انگریزی ایسے یا اردو مضمون
نگاری ہوتی ہے وہ فیشن کے طور پر انشائیہ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اختر
اورینوی کے ذہن میں واضح طور پر Essay مضمون نگاری کی اصطلاح
تھی۔''(۲۱)

جہاں ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کے موجد کا اعتراف کر کے اس کی تردید کر دیتے ہیں وہیں
جمال پاشا وزیر آغا کی تقلید میں انشائیہ کا سہرا ان کے سر باندھنے پر آمادہ ہیں۔ وزیر آغا اور احمد جمال
پاشا نے اپنے مضامین میں اختر اورینوی کے بارے میں جو رائے قائم کی اسکی تردید اختر اورینوی کے
اس اقتباس سے ہو جاتی ہے۔ جس میں انھوں نے واضح طور پر انشائیہ کی اصطلاح اور اسکے فنی محاسن
گنوائے ہیں اس لئے دونوں حضرات کا الزام ہے کہ اختر اورینوی کے ذہن میں انشائیہ کا واضح تصور
نہیں تھا بلکہ مضمون کی اصطلاح ان کے ذہن میں تھی ملاحظہ ہو اختر اورینوی کا یہ خیال:

دراصل انشائیہ فلسفیت اور رنگینی کا مجموعہ ہوتا ہے ایسی فلسفیت جس میں
دل جلاپن، خشونت یا وحشت خیز سنجیدگی نہ ہو۔ یہاں فلسفہ ہوتا ہے مگر بغیر روندھے
ہوئے چہرے کی رنگینی ہوتی ہے مگر ذمہ داری کے ساتھ، رندی اور احتساب کا
عجیب وغریب مجموعہ، مضحکہ خیز نہیں ہوتا ہے بلکہ امتزاج کامل کے پنجے میں بڑی
دلنواز شخصیت پیدا کرتا ہے۔ ایک صوفیت جس میں مزاح کا نمک ملا دیا جائے۔
انشائیہ کے خاص رنگ میں ہونا چاہئے۔ انشائیہ میں مختصر افسانوں کی تکنیک برت
لی جائے تو پھر انشائیہ نہیں رہے گا۔ بعض ادباء انشائیہ لکھنے بیٹھتے ہیں مگر اس میں
ماجرا اتنا بالیدہ ہو جاتا ہے اور مختصر تکنیک اتنی چھا جاتی ہے کہ نتیجہ میں جو چیز پیدا
ہوتی ہے وہ کم از کم انشائیہ نہیں ہوگی۔ (۲۲)

متذکرہ بالا اقتباس میں انشائیہ نگاری کے چند تقاضوں اور خصوصیات کا ذکر ملتا ہے جو
انشائیہ پر سب سے قدیم اور پہلی شعوری کوشش ہے، جس سے دور حاضر میں بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے
تا کہ اس کی تردید کر کے نئے نئے فنی محاسن اختراع کئے جائیں۔ روایت کے امکانات کا انکشاف کرنا

ماضی سے مطابقت رکھنا صحت مند ادب کی دلیل ہے۔ آج انشائیہ نگاری کی جو صورت حال ہے اور جس قدر یہ ترقی کی منازل طے کر چکا ہو اس کے باوجود بھی مذکورہ بالا اقتباس میں کچھ باتیں ایسی ہیں جن کو انشائیہ میں ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے اور ان سے انشائیہ کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں۔ اسلئے اختر اور ینوی پر وزیر آغا کا الزام قابل قبول نہیں ہے اس بحث کو سمیٹتے ہوئے آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں غیر ارادی طور پر انشائیہ کے چراغ جگہ جگہ ٹمٹماتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں مگر ان سے انشائیہ کی شاہراہ تک گزر ممکن نہ ہوسکا۔ یہ حقیقت ہے کہ جب اردو نثر میں تحریری و تخلیقی صلاحیت پیدا ہوئی اور اسلوب کی رنگارنگی منظر عام پر آنے لگی تو اردو نثر میں انشائیہ کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ اردو نثر کے ابتدائی دور سے دور حاضر تک نثری ادب پر نظر ثانی کریں تو جگہ جگہ کچھ ایسی تحریریں ملتی ہیں جن کو دیکھ کر انشائیہ کا شبہ ہوتا ہے مگر یہ کہیں کہیں جزوی طور پر ملتی ہے اس لئے ان کی بنیاد پر ہم کسی قدیم نثر پارے کو انشائیہ نہیں کہہ سکتے ہیں اس بات سے مجھے بھی کوئی انکار نہیں کہ ملا وجہی کی نثر میں انشائیہ نما تحریریں ملتی ہیں۔ میر امن کے یہاں اسلوب کی تازہ کاری اور مرزا غالب کے مکتوب میں بے ربطی اور بے تکلفی ملتی ہے مگر یہ سب خصوصیات جو انشائیہ کے لئے مخصوص کی گئی ہیں وہ کافی بعد میں طے کی گئیں ہیں جبکہ انشائیہ نما تحریریں اردو نثر کے ابتدائی دور سے ہی ملنی شروع ہو جاتی ہیں۔ کسی بھی نثر نگار کے یہاں پورے طور پر یکجا نہیں ملتی ہیں۔ غیر رسمی طرز تحریر، اسلوب میں شگفتگی اور تازہ کاری، موضوع کی رنگارنگی، اور انکشاف ذات کا مجموعہ اگر کوئی تحریر ہے تو ہم اسے انشائیہ تسلیم کر سکتے ہیں لیکن ایسی تحریریں جو کسی مقصد کے تحت نہ لکھی گئی ہوں اور نہ ہی اس کے پس پردہ کوئی اصلاحی پہلو ہو انشائیہ کہلا سکتی ہے۔

انشائیہ کا فن

اردو انشائیہ کا سرچشمہ انگریزی ایسے جو رفتہ رفتہ لائٹ ایسے اور پرسنل ایسے کی اصطلاح میں تبدیل ہوا جسے ہم انشائیہ کی اصطلاح کے مترادف مانتے ہیں۔ اردو انشائیہ کے لئے انگریزی میں لائٹ ایسے یا پرسنل ایسے کو مخصوص کیا گیا۔ اردو مضمون نگاری کی شروعات سرسید اور رفقاء سرسید سے ہوتی ہے۔ جنہوں نے انگریزی ایسے کی تقلید میں اردو میں رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' نکالا اور اس میں اصلاحی مضمون لکھنے کی بنیاد ڈالی جس کے پس پردہ اصلاح معاشرہ کا مقصد تھا اسلئے یہ کہا جا سکتا

ہے کہ سرسید انشائیہ کے قریب تک پہونچے تھے۔ طرز تحریر انداز بیان میں سادگی مگر مدلل اور سنجیدہ طرز تحریر، جس کی بنیاد پر ہم ان کو مضمون نگاری کا موجد مان سکتے ہیں اس بات کا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ انشائیہ کی راہ ہموار کرنے میں سرسید کی تحریریں معاون و مددگار ثابت ہوئیں۔ سرسید کے بعد مضمون کو انشائیہ کا نام دیا جانے لگا۔ جبکہ یہ سراسر غلط ہے جسکی تفصیل گزشتہ صفحات میں موجود ہے۔ انشائیہ کو مضمون سے الگ باضابطہ ایک صنف کی حیثیت حاصل ہے سرسید کی مضمون نگاری سے انشائیہ نگاری کے درمیانی عرصے میں متعدد نام ایسے ہیں جنکی جزوی تحریریں انشائیہ کے ضمن میں آتی ہیں۔ مثلاً آزاد، منشی ذکاء اللہ، عبدالحلیم شرر، میر ناصر علی، خواجہ حسن نظامی، سجاد انصاری، رشید احمد صدیقی، اور دیگر حضرات کی کچھ تحریروں کو ہم انشائیہ کے ضمن میں رکھ سکتے ہیں انکی تمام تحریروں کو ہم انشائیہ نہیں کہہ سکتے ہیں مگر ان کی کچھ تحریروں کو انشائیہ تسلیم کیا گیا ہے کیونکہ اردو انشائیہ کی تحقیق بھلے ہی بعد میں ہوئی مگر انشائیہ نما تحریریں نثر کے ارتقاء اور بالخصوص مضمون نگاری کے ابتدائی دور سے ہی ملنا شروع ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی کو اردو انشائیہ کے فنی محاسن کی نامزدگی اور انشائیہ کے لفظ کو پہلی بار لائٹ ایسے یا پرسنل ایسے کے مترادف الفاظ کے طور پر متعارف کرانے، سید علی اکبر قاصد کے مجموعہ ''ترنگ'' کو اردو انشائیہ کا پہلا مجموعہ قرار دینے کے اعتبار سے اردو انشائیہ کے باضابطہ آغاز کا موجد قرار دینا غلط نہ ہوگا۔ شعوری طور پر انشائیہ کی شروعات اردو میں اختر اورینوی کے لفظ انشائیہ کی شروعات کے بعد ہوئی۔ اس سے قبل انشائیہ جیسی تحریریں تو ملتی تھیں مگر انہیں کسی مخصوص نام سے نہیں جانا جاتا تھا۔ بلکہ ہر ادیب اپنے اپنے طور پر ادب پارہ'' نمک پارہ 'جواب مضمون اور انشائے لطیف وغیرہ کے نام سے موسوم کرتا۔ ایسی تمام تحریروں کو مضمون 'طنز ومزاح اور ظرافت کے زمرے میں رکھا جاتا تھا۔ کیونکہ اردو انشائیہ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہلکے پھلکے مضامین جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ وہ ہلکے پھلکے مضامین جسمیں مزاح وظرافت کی چاشنی ہو۔ اس غلط فہمی سے انشائیہ کو پہلی بار اختر اورینوی نے نجات دلائی اس لئے اردو میں انشائیہ کی اصطلاح کی شروعات ڈاکٹر اختر اورینوی نے کی اس روایت کو ڈاکٹر محمد حسنین نے آگے بڑھایا اور بعد میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو انشائیہ کی تحریک کو پائیداری بخشی۔ جس سے کچھ غلط فہمیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ وزیر آغا نے انشائیہ کی تحریک آگے بڑھائی مگر ان کی تحریک میں صرف چند حضرات ہی شامل تھے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہی انشائیہ اور انشائیہ نگار ہیں جس کو وزیر آغا مانتے ہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت سے انشائیہ نگار اور انشائیے موجود ہیں جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ گزشتہ صفحات

میں جس غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ان مباحث سے ناقدین اور ماہرین ادب نے وقتاً فوقتاً اپنے اپنے طور پر انشائیہ کو سمجھنے کی کوششیں کیں ہیں جس سے انشائیہ کی ہیئت' تعریف اور خصوصیات کو واضح کیا گیا ہے۔ جب سے انشائیہ بطور مخصوص صنف نامزد ہوئی اسی عرصے سے انشائیہ کی تعریف کا سلسلہ بھی جاری ہے کچھ مبہم کچھ واضح' کچھ اشاروں میں کنایوں میں تو کچھ مثالوں کے ذریعہ انشائیہ کیا ہے کا جواب دیا گیا ہے۔ اختر اورینوی کا ذکر گزشتہ صفحات میں کئی بار آیا ہے ان کے ایک اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کی نظر میں انشائیہ کو غیر سنجیدہ ہونا چاہیے' کہانویت کو انشائیہ کے لئے کفر بتایا ہے۔ رنگین ہو'مصنف کے شخصیت کا اظہار ہو اور چھپے پہلو کی نقاب کشائی وغیرہ جس تحریر میں موجود ہو وہ انشائیہ کہنے کے لائق ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کا خیال ہے کہ:

''انشائیہ ایک ہلکا پھلکا پر لطف اور شگفتہ مضمون ہوتا ہے جس میں انشائیہ نگار کی حیثیت اپنا جلوہ دکھاتی رہتی ہے۔ انشائیہ فکاہی رنگ میں ڈوب کر بھی ہمارے لئے تفریح اور مسرت کا سامان فراہم کرتے ہے۔(۲۳)

ڈاکٹر وحید قریشی ''اردو کا بہترین انشائی ادب'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''ذہن کو یک لخت ایک نئی دنیا میں لا ڈالنا اس ادب پارہ کا کام ہے اس سے زندگی کو نئے زاویئے سے دیکھنے کا شعور پیدا ہوتا ہے اور روز مرّہ زندگی کے کئی پامال گوشے نئی معنویت اختیار کرتے ہیں۔ اس میں جو بات بھی کی جاتی ہے اپنی ذات کے حوالے سے کی جاتی ہے یا کم از کم اپنی ذات کو اس میں دخیل ضرور رکھا جاتا ہے انشائی ادب کا انحصار اس کا بنیادی وصف ہے۔''(۲۴)

ڈاکٹر سلام سندیلوی ''ادب کا تنقیدی مطالعہ'' میں انشائیہ کا تعارف کراتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

انشائیہ نگاری مضمون نگاری کا وہ جز ہے جس میں مصنف اپنی ذات اور انفرادی تجربات کو پیش کرتا ہے اس پیش کش میں اس کی شخصیت کافی نمایاں رہتی ہے۔ اس طرح انشائیہ میں ایک خاص قسم کا داخلی رنگ پایا جاتا ہے''(۲۵)

نظیر صدیقی ''شہرت کی خاطر'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''انشائیہ ادب کی وہ صنف ہے جسمیں حکمت سے لیکر حماقت تک اور حماقت سے لیکر حکمت تک کی ساری منزلیں طے کی جاتی ہیں یہ وہ صنف ادب ہے جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کئے جاتے ہیں۔''(۲۶)

غلام جیلانی اصغر اپنے ایک مضمون ''انشائیہ کیا ہے'' میں لکھتے ہیں:

آپ جب انشائیے ختم کر لیتے ہیں تو آپ کی سوچ کو ایک نیا اور غیر رسمی زاویہ مل جاتا ہے ایسا لگتا ہے جیسے آپ سر کے بل کھڑے ہو کر دنیا کو دیکھ رہے ہوں اور آپ پر بزرگی کی ایسی ابعاد منکشف ہو رہی ہوں جو اس سے پہلے آپ کے اندر کی آنکھ یعنی تیسری آنکھ سے پوشیدہ تھیں۔''(۲۷)

تفصیل سے جن حضرات نے اردو انشائیہ پر بحث کی ہے ان میں سید محمد حسنین کو اولیت حاصل ہے انہوں نے پہلی بار اگست ۱۹۵۸ء میں صنفِ انشائیہ اور انشائیے کے مقدمے میں فن انشائیہ پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ ان کے خیال میں انشائیہ:

۱۔ ''انشائیہ ذہن کی ایک آزاد ترنگ ہے''

۲۔ ''انشائیہ کسی عنوان پر قلم کار کی گپ ہے یہ گپ سنی سنائی نہیں ہوتی اس میں آپ بیتی اور جگ بیتی کی دھوپ چھاؤں ہوتی ہے یہ ذہنی لہروں کی پیداوار ہے جو کبھی کبھی چلتی ہیں اور دبے پاؤں آتی ہیں اچھا اور کامیاب انشائیہ ذہن کا ایک شرارہ ہوتا ہے جس کی ہر چنگاری آزاد اور منتشر ہوتی ہے۔ ہم اسے ادب کی پھلجھڑی کہہ سکتے ہیں۔''

۳۔ ''انشائیہ سے بھی ہم کچھ پاتے ہیں ایسی عزیز اور گم شدہ کیفیت جو ہمارے روز و شب میں آنکھوں سے اوجھل رہتی ہے ایسی لطف خیز فکر و فہم جو ٹھوس اور نا قابل انکار حقائق میں دبی اور نگاہوں سے روپوش رہتی ہے۔''

۴۔ ''انشائیہ ہمیں غیر سنجیدہ بناتا ہے۔ اس سے ہمیں رندانہ خود بینی اور متجسسانہ آوارہ خیالی آتی ہے۔

۵۔ ''انشائیہ ادب کی وہ کمین گاہ ہے جہاں قلم کار بیٹھ کر جس پر چاہے تیر چلا سکتا ہے.... ہم انشائیہ نگار پر کوئی قانونی دفعہ نہیں چلا سکتے کیونکہ ادب کا یہی وہ گوشہ ہے جہاں قلم کار کو ہر طرح کے بیان کی چھوٹ ہے۔ یہ گفتار کا وہ غازی ہے جسے سات نہیں سیکڑوں خون معاف ہیں۔''

۶۔ ''انشائیہ غیر سنجیدہ و غیر عالمانہ اور غیر منظم تاثرات خفیف الفکر معلومات پر مبنی نگارشات ہے(۲۸)

درج بالا حقائق جو ڈاکٹر محمد حسنین کی کتاب ''صنف انشائیہ اور چند انشائیے'' سے اخذ کئے گئے ہیں جن میں الگ الگ انداز میں انشائیہ کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے اور انشائیہ کیا ہے کے تحت یہ کافی حد تک تشفی بخش ہیں۔ اب اردو انشائیہ کے دوسرے بڑے نقاد ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے بھی انشائیہ کے ضمن میں کافی معاون و کارآمد ہے، جن کے بغیر اردو انشائیہ کی تعریف ادھوری رہ جائے گی۔ وزیر آغا نے گاہے بہ گاہے انشائیوں پر مضمون لکھے جس میں انشائیہ کیا ہے پر الگ الگ انداز میں اپنے بیانات اور آراء ظاہر کی۔ ملاحظہ ہو وہ تفصیل:

۱۔ ''انشائیہ اس صنف نثر کا نام ہے، جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیاء یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔''

۲۔ ''ایک اچھا انشائیہ پڑھنے کے دوران آپ شاید حظ مزاح تعجب طنز، اکتسابِ علم اور تخیل کی سبک روی ایسے بہت سے مراحل سے روشناس ہوں لیکن انشائیہ کے خاتمے پر آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ نے زندگی کے کسی تاریک گوشے پر روشنی کا ایک نیا پرتو دیکھا ہے اور آپ زندگی کی عام سطح سے اوپر اٹھ آئے ہیں۔ کشادگی اور رفعت کا یہ احساس ایک ایسا متاع گراں بہا ہے جو نہ صرف آپ کو مسرت بہم پہنچاتا ہے بلکہ آپ کی شخصیت میں بھی کشادگی اور رفعت پیدا کرتا ہے۔''

۳۔ ''اس کا کام تصویر کا دوسرا رخ پیش کرنا اور ہمیں عادت اور تکرار کے حصار سے لحظہ بھر کے لئے آزادی دلانا ہے تا کہ ہم غیر جانبدارانہ طریقے سے زندگی کے روشن یا تاریک رخ کا جائزہ لے سکیں۔ واضح رہے کہ انشائیہ کا خالق کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتا اور نہ کوئی مشورہ ہی دیتا ہے اس کے علاوہ کوئی مکمل نقطۂ نظر پیش کرنے سے بھی اجتناب کرتا ہے۔ اس کا کام محض ایک عام چیز کے کسی انوکھے اور تازہ پہلو کی طرف آپ کو متوجہ کرنا اور آپ کو ایک مخصوص انداز سے سوچنے کی ترغیب دیتا ہے۔''

۴۔ ''اس کا خالق اس شخص کی طرح ہے جو دفتر سے چھٹی کے بعد اپنے گھر پہنچتا

ہے اور چست اور تنگ سا لباس اتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لیتا ہے اور آرام دہ موڑھے پر نیم دراز ہو کر اور حقے کی نے ہاتھ میں لے کر انتہائی بشاشت اور مسرت سے اپنے احباب سے مصروف گفتگو ہو جاتا ہے۔ انشائیہ کی صنف اسی شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے۔''

۵۔ ''انشائیہ زاویہ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے اور دوسرے کنارے سے دیکھنے کی ایک روش ہے۔ انشائیہ ایک مثبت بغاوت ہے، جو شخصیت پر چڑھے ہوئے زنگ کو اتارتی ہے۔ تشنج کو رفع کرتی ہے اور انسان کو جذباتی اور نظریاتی جکڑبندیوں سے نجات دلا کر آزادہ روی کی روش پر گامزن کر دیتی ہے۔''

۶۔ ''انشائیہ ایک ایسی غیر افسانوی صنفِ نثر ہے جو قاری کو بیک وقت فکری لطف اندوزی، جسمانی تسکین اور جمالیاتی حظ مہیا کرنے پر قادر ہے۔ اسی لئے میں اسے امتزاجی صنف کا نام دیتا ہوں جس میں کہانی کا مزہ، شعر کی لطافت اور سفرنامے فکری تحریک یکجا ہو گئے ہیں تاہم انشائیہ محض ان اوصاف کی حاصل جمع کا نام نہیں ہے وہ ان سب کو اپنے اندر جذب کر کے خود ایک ایسی اکائی بن کر نمودار ہوتا ہے، جس کی انفرادیت ان جملہ اوصاف کی حاصل جمع سے کچھ ''زیادہ'' ہوتی ہے اس اعتبار سے انشائیہ کا ایک اپنا اسٹرکچر ہے جو اسٹرکچرنگ (Structuring) کے عمل کو بروئے کار لا کر سدا نئے نئے امکانات کی طرف پیش قدمی کرتا ہے۔''(۲۹)

ادب کی دیگر تمام اصناف کے مقابلے اردو انشائیہ اپنی کم عمری کی وجہ سے ابھی تک آب و گِل کی منزل میں ہے انشائیہ کی تعریف پر ابھی تک اتفاق رائے نہیں ہے بلکہ ہر انشائیہ نگار ناقد اور ماہر ادب جب انشائیہ پر اپنی توجہ مرکوز کرتا، اس کا مطالعہ کرتا، غور و فکر کرتا یا پھر انشائیہ تخلیق کرتا تو اکثر و بیشتر اُس پر انشائیہ کا کوئی نیا پرتو کھلتا اور وہ اپنی ہر تخلیق سے کچھ نہ کچھ سیکھتا پھر اسے انشائیہ کی تعریف یا مفہوم کو بیان کرنے میں راہنمائی کے طور پر پیش کر دیتا ہے۔ تخلیق کار اپنے تجربات، مشاہدات اور محسوسات کے سہارے لفظوں میں اس کی کیفیت بیان کرتا ہے، جس سے انشائیہ کے خدوخال متعین ہوتے ہیں۔ ہر انسان کے سوچنے کا انداز الگ ہوتا ہے۔ زاویہ نگاہ جدا ہوتا ہے اسلئے جس نے انشائیہ کے جس پہلو کو دیکھا جس زاویہ سے دیکھا اس کے بیان میں اس کی جھلک دکھائی

دیتی ہے ان تمام تعریفوں اور بیانات کو یکجا کیا جائے تو ان میں کچھ باتیں مشترک ہیں جو اپنے آپ میں کافی مماثلت رکھتی ہیں اور کچھ نجی مشاہدے کی ضامن ہیں اسلئے ان تمام تعریفوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس فیصلے پر پہنچا جاسکتا ہے کہ انشائیہ ایسے طرز تحریر کے مجموعے کا نام ہے جس میں بے ربطی اور سادگی تو ہو مگر عامیانہ پن نہ ہو، غیر سنجیدہ اور بے تکلف تحریر تو ہو مگر مہملت نہ ہو، اس میں انکشاف ذات اور شخصیت کا اظہار تو ہو مگر "میں" کی انائیت اور سب سے اہم ذات بذات خود نہ ہو بلکہ انکشاف ذات اس طرح ہو کہ آپ بیتی جگ بیتی بن جائے۔ پامال گوشے اور مخفی پہلو کی نقاب کشائی تو ہو مگر انوکھے پہلو کی طرف متوجہ کرے اور مخصوص انداز میں سوچنے کی ترغیب دے، موضوع کی آزادی یا آزاد خیالی تو ہو مگر ذہنی سطح پر اسکی حدود متعین ہونی چاہیے۔ جس میں غزل جیسا ایجاز واختصار ہو مگر تشنگی باقی رہے۔ اسلوب کی تازہ کاری، بیان میں سادگی اور شگفتہ بیانی ہو، طنز ہو، مزاح ہو، جس کا کام حظ اور مسرت بہم پہچانا ہو مگر یہ سب کچھ صرف ایک سہارے کے طور پر استعمال کیا جائے نہ کہ ان کو لازمی عنصر تصور کرلیا جائے بلکہ یہ حسب ضرورت استعمال ہونے چاہیے تاکہ تخلیق کا معیار بلند رہے اور نتیجہ میں جو تحریر وجود میں آئے وہ انشائیہ کہلائے۔

انشائیہ بہر حال ایک تخلیق ہے اور اس کے تخلیقی عمل کو حماقت اور حکمت، مہملیت اور مجہولیت، طنز ومزاح اور نہ جانے ایسے ہی کن کن خطابات سے نوازا گیا۔ انشائیہ کا عرفان کبھی سر کے بل چلنے سے، تو کبھی ٹانگوں میں سر پھنسا کر دنیا دیکھنے سے، کبھی پگڈنڈیوں پر چلتے چلتے پھسل کر کیچڑ میں لتھڑ جانا یا دلدل میں پھنس جانے سے تو کبھی تیس مار خاں بن کر آوارہ گردی کرنے سے، کبھی جیک آف آل بن جانے سے میسّر ہوتا ہے جس کو پڑھنے کے بعد قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے برسوں کی گمشدہ چیز مل گئی ہو جس سے حظ ومسرت حاصل ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی ذہنیت، زاویہ نگاہ اور شخصیت یا ذات میں وسعت یا کشادگی پیدا ہو جاتی ہے اور قاری خود کو عام سطح سے اوپر اٹھا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے چونکہ اس صنف میں انشائیہ نگار کا فطری مزاح اس کے مشاہدہ سے مطابقت رکھتا ہے اس کے تجربات اس کی تحریر میں معاون ثابت ہوتے ہیں لہذا انشائیہ نگار جس قدر وسیع الذہن، تیز نظر (جسے قیامت کی نظر بھی کہتے ہیں) اور دور اندیش ہوگا اسی قدر اس کے انشائیوں میں مختلف زاویہ نظر سے حالات کے مشاہدے کے ساتھ انشائیہ کی ہیئت سے تعارف حاصل ہوتا چلا جاتا ہے اور انشائیہ کی پر اسراریت آہستہ آہستہ منظر عام پر آتی جاتی ہے۔ انشائیہ کے پیکر میں لاتعداد پرتیں چھپی ہیں۔ جو جتنی پرتیں اتاریگا انشائیے کے اتنے ہی زاویے اور مخفی پہلو ابھر کر سامنے

آئیں گے۔ جس میں انشائیہ منعکس ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ ان تمام بیانات کی روشنی میں انشائیہ کی چند خصوصیات جو تمام ناقدین اور انشائیہ نگار کے یہاں مشترک ہیں یا خاص خصوصیت کی حامل ہیں۔ انکی روشنی میں اس مخصوص صنفِ ادب کی خصوصیات کا بیان تفصیلی طور پر کیا جاسکتا ہے۔

انشائیہ کی خصوصیات کے بارے میں چند بیانات ملتے ہیں جن کا ذکر یہاں کرنا ضروری ہے تاکہ انشائیہ کی خصوصیات کا تعین آسانی سے ہو سکے۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین نے (۱) غیر علمیت (۲) غیر سنجیدگی (۳) داخلیت (۴) غیر کہانویت (۵) مزاح (۶) غیر سالمیت (۷) خیالات کی پختگی اور (۸) انشاء پردازی وغیرہ کو انشائیہ کی خصوصیات بتایا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کی مندرجہ ذیل خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں:

(۱) غیر رسمی طریق کار (۲) شخصی ردّ عمل (۳) عدم تکمیل (۴) ڈھانچے کا لچیلا پن (۵) موضوع اور نقطۂ نظر کا انوکھا پن (۶) اختصار (۷) اسلوب کی تازگی۔

ڈاکٹر سلیم اختر اپنی کتاب "انشائیہ کی بنیاد میں لکھتے ہیں:

> انشائیہ پر مختلف نقادوں کی تحریروں سے اس کی تکنیک کے بارے میں بہت کچھ پڑھ کر مندرجہ ذیل امور ذہن میں ابھرتے ہیں (۱) اختصار (۲) غیر رسمی طریق کار (۳) اسلوب کی شگفتگی، (۴) عدم تکمیل کا احساس (۵) شخصی نقطۂ نظر اور (۶) عنوانات کا موضوع یا نقطۂ نظر سے ہم آہنگ نہ ہونا" (۳۰)

ڈاکٹر نصیر احمد خاں اپنی کتاب "آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ" کے دیباچہ "اردو انشائیے کا منظر نامہ" میں یوں رقم طراز ہیں:

> "انشائیہ نثری اظہار کی ایک ایسی صنف ہے جس میں حقیقت کا اظہار، شخصی ردّ عمل، عدم تکمیل، رمزیت واشاریت، غیر منطقی ربط، اختصار، دعوتِ فکر، مسرت بہم پہچانے کی صلاحیت وزبان وبیان میں بانکپن اور مرکزی بات سے کچھ ضمنی باتوں کا ذکر جیسی خصوصیات پائی جاتی ہوں۔" (۳۱)

درج بالا بیانات اور گزشتہ صفحات کی بحث سے اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ انشائیہ ایک حد تک شخصی تصنیف ہے جو مصنف کی ذہنی اختراع پر منحصر کرتا ہے انشائیہ میں اس قدر آزادی اور لچیلا پن ہے کہ اس کی ہیئت اور تکنیک یا کسی شکل وصورت کا تعین ممکن نہیں پھر بھی درج ذیل خصوصیات کا ہونا انشائیہ کے لئے اہم ہے۔ (۱) غیر رسمی طریقۂ کار یا بے ربطی (۲) غیر سالمیت یا عدم تکمیل

(۳) انکشافِ ذات (۴) مسرت آفرینی (۵) موضوع کا تنوع (۶) زبان و بیان میں بانکپن و اختصار (۷) بے بات سے بات پیدا کرنا (۸) شخصی ردِّعمل اور (۹) دعوتِ فکر وغیرہ۔

آگے اسکی خصوصیات سے تفصیلی بحث بھی کرنا لازمی ہے تاکہ خدوخال متعین ہو سکے۔

(۱) غیر رسمی طریقۂ کار یا بے ربطی

اردو انشائیہ کی شناخت ہی اس کی بے ربطی سے ہوئی۔ ابتداء میں جب انشائیہ اور مضمون خلط ملط تھا تو انشائیہ پر غیر سنجیدگی ہلکا پھلکا اور بے ربط و منتشر خیالات کا لیبل لگایا گیا اور مقالہ یا مضمون کو سنجیدہ اور مکمل مضمون کہا گیا۔ انشائیہ میں خیالات کی بے ربطی اور غیر منطقی ربط پایا جاتا ہے۔ جسکی ایک وجہ یہ ہے کہ انشائیہ نگار اپنی تخلیق میں مختلف موضوعات کو جگہ دیتا ہے بات سے بات پیدا کرتا ہے اور ایک غیر منطقی سلسلہ قائم ہو جاتا ہے جسے ہم انشائیہ کہتے ہیں۔ اس لئے تمام موضوعات پر مدلل بحث یا کسی ایک نقطۂ نظر سے بھی بحث ممکن نہیں۔ اسلئے بے ربطی اور منتشر خیالی کے حربے کو انشائیہ میں استعمال کیا جاتا ہے مگر یہ صرف وسیلے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں انکی بے ربطی میں بھی ایک ربط ہوتا ہے اسی وجہ سے اس کو نثری غزل بھی کہا جاتا ہے۔ جیسے غزل کے ہر شعر میں الگ الگ خیال کو باندھا جاتا ہے لیکن ہیئت کے اعتبار سے ان میں ایک منطقی ربط ہوتا ہے یعنی ردیف و قافیے کی وجہ سے غزل کے تمام اشعار ایک کڑی کی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح انشائیہ میں بے ربطی ہوتی ہے موضوعات کی بہتات ہوتی ہے پھر بھی وہ کسی سطح پر مرکزی خیال سے نزدیک یا اسکے ارد گرد گھومتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ انشائیہ کی خصوصیت کی بنیاد پر ہی مختلف ماہرین ادب نے اسے ذہن کی آزاد ترنگ اور غیر سنجیدہ تحریر کہا ہے۔ انشائیہ کی دلکشی کا اصل سبب اسکی منتشر خیالی اور بے ربطی ہے یہ ایک ایسا نثر پارہ ہے جس میں بے ربط خیالوں میں ایک ربط ملتا ہے یہ ایک قسم کی ذہنی آوارگی ہے جہاں سے انشائیہ نگار اپنے قلم کے گھوڑے دوڑاتا ہے۔ کبھی اسے قلم کار کی گپ یا ذہن کی آوارہ روی کہا جاسکتا ہے۔ تحریر میں جتنی بے ربطی ہوگی انشائیہ کا معیار اتنا ہی بلند ہوگا۔ اس کی مشابہت سمندر کی موجوں سے بھی کی جاتی ہے۔ جس طرح سمندر کی موجوں میں انتشار بے چینی اور بے ربطی تو ہوتی ہے مگر دور سے اس میں لہروں کی طغیانی کے بجائے پانی کا خزانہ معلوم ہوتا ہے۔ جہاں صرف پانی ہی پانی دکھائی پڑتا ہے ویسے ہی انشائیہ میں اتھل پتھل ہوتی ہے مگر اس کی اندرونی سطح پر ایک ربط بھی ہوتا ہے جس سے ظاہر و

باطن کا فرق واضح ہوتا ہے۔

(۲) غیر سالمیت یا عدم تکمیل

انشائیہ مقالہ سے بالکل الگ صنف ہے انشائیہ میں غیر سنجیدہ انداز میں مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا جاتا ہے اس لئے اس کی جملہ خصوصیات میں عدم تکمیل بھی ایک اہم خصوصیت ہے۔ عدم تکمیل سے مراد موضوع کی غیر سالمیت یا تشنگی ہے کسی بھی موضوع پر انشائیہ نگار جب اظہار خیال کرتا ہے تو وہ بات سے بات پیدا کرتا ہے اور مرکزی بیان کو واضح کئے بغیر کسی دوسرے موضوع سے بحث کرنے لگتا ہے اس لئے بغیر کسی دلیل اور وضاحت کے انشائیہ نگار انشائیہ کی شروعات کر سکتا ہے۔ اس میں نہ گہرائی ہوتی ہے نہ گیرائی بلکہ انشائیہ کب شروع ہوا اور کب ختم اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے اس میں نہ دلائل پیش کئے جاتے ہیں اور نہ حقائق کی روشنی میں اس کی وضاحت کی جاتی ہے بلکہ انشائیہ سیل رواں اور برساتی ندی کی طرح میدانی علاقوں میں پھیلتا جاتا ہے اور برسات ختم ہونے کے بعد جیسے پانی مختلف مقامات پر جم جاتا ہے جو الگ الگ ہیئت اختیار کر لیتا ہے یہ انشائیہ کے موضوعات کی طرح ہے۔ انشائیہ نگار بھی مختلف موضوعات کا احاطہ ایک ہی انشائیہ میں کر لیتا ہے مگر یہ سب الگ الگ ہوتے ہیں جس کی واحد وجہ یہ ہے کہ انشائیہ نگار قاری کو زیادہ سے زیادہ باتوں سے آشنا کرانا چاہتا ہے اسی کوشش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں وہ مختلف موضوعات کے کسی ایک پہلو پر چند جملے میں اظہار خیال کر کے آگے بڑھ جاتا ہے جس سے موضوع تشنہ رہ جاتا ہے۔ جس کو ہم انشائیہ کی اصطلاح میں عدم تکمیل یا غیر سالمیت کے نام سے جانتے ہیں۔ انشائیہ اپنے خدوخال کی وجہ سے اپنے اندر غزل کی جولانیاں رکھتا ہے۔ جس طرح غزل میں شاعر مختلف موضوعات کو سمو لیتا ہے۔ ہر شعر میں الگ الگ موضوع پر اظہار خیال کرتا ہے ویسے ہی انشائیہ میں بھی انشائیہ نگار قاری کے لئے مختلف موضوعات کے التزام کے باوجود تشنگی کا احساس دلاتا ہے تاکہ وہ موضوع کی تہہ تک جا کر موضوع کے دوسرے مخفی گوشے کو منور کر سکیں۔ انشائیہ نگار قاری میں اپنے فن کے ذریعہ ایک خاص تجسس پیدا کرتا ہے لیکن باوجود اس کے تشنگی کا احساس برقرار رکھتا ہے اچھا انشائیہ وہی ہوتا ہے جس کے مطالعہ کے دوران قاری کے ذہن میں طرح طرح کے سوالیہ نشان بنتے چلے جائیں اور جیسے ہی انشائیہ ختم ہو قاری ایک لمحے کیلئے سوچ میں ڈوب جائے۔ قاری کا یہ عمل انشائیہ کے غیر سالمیت اور عدم تکمیل کی گواہی دیتا ہے۔

(۳) انکشافِ ذات:

انشائیہ میں اس بات پر زیادہ دھیان دیا جاتا ہے کہ انشائیہ اور انشائیہ نگار ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں۔ انشائیہ میں طرزِ بیان کے ذریعہ انشائیہ نگار خود کو دخیل کرتا ہے۔ انشائیہ کے کسی بھی موضوع یا شخصیت پر بحث کرنے میں انشائیہ نگار اپنی ذات کو حوالے کے طور پر ہمیشہ پیش پیش رکھتا ہے۔ جس میں اس کے اپنے تجربات و مشاہدات کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ انکشاف ذات کے عمل سے انشائیہ میں فنی حسن پیدا ہوتا ہے، جس سے انشائیہ نگار کی طرزِ تحریر، اسلوب نگارش اور صلاحیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے انشائیہ نگار کا مشاہدہ جتنا وسیع ہوگا انشائیہ میں اس کی ذات کے حوالے سے اس کی شخصیت کا اظہار بھی اتنا ہی عمدہ ہوگا اور اس سے اعلیٰ درجے کا انشائیہ وجود میں آئے گا۔ انشائیہ دراصل لکھنے والے کی تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر ہوتا ہے اور اس میں انشائیہ نگار اپنی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو متور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انشائیہ کو خود کلامی کا عمل بھی کہتے ہیں اور اپنی شبیہ بھی بنانا تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں فرد کو سماج پر ترجیح دی جاتی ہے اور کُل کے بدلے جز کو مدِنظر رکھ کر انشائیہ تخلیق کیا جاتا ہے اس میں انشائیہ نگار اپنے دل کے اندر چھپے ہوئے چور کو پکڑ لیتا ہے اور اپنی ذات کو اپنے ضمیر سے آزاد کرالیتا ہے۔ وہ اپنے اندر کے پوشیدہ عمل سے نقاب ہٹاتا ہے اور اپنی کمزوریوں اور برائیوں کے نقوش ابھار کر ان سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ انشائیہ بہت زیادہ شخصی ہوا کرتا ہے مگر قطعاً اس سے یہ مراد نہیں کہ انشائیہ نگاری کی شخصیت یا اس کے اثرات قلم بند ہو جاتے ہیں بلکہ یہ اظہارِ ذات کا وہ وسیلہ ہے، جس میں انشائیہ نگار اپنے ذاتی اور انفرادی نقطۂ نظر و تجربات کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کی پیشکش میں اس کی شخصیت کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ انشائیہ نگار اپنے داخلی احساسات اور تجربات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ انشائیہ میں داخلیت و رمزیت پیدا ہو جاتی ہے، جس سے انکشاف ذات ہوتا ہے۔

(۴) مسرت آفرینی:

انشائیہ کا کام قاری کو حظ و مسرت بہم پہنچانا بھی ہے۔ انشائیہ نگار بے بنیاد یا بے سر پیر کی باتوں کو اسطرح بیان کرتا ہے کہ ان میں لفظوں کی سلیقہ مندی سے مزاح پیدا ہوتا ہے اور اس کے مطالعے کے بعد قاری کو خوشی محسوس ہوتی ہے۔ انشائیہ ایک ہلکے پھلکے اور رنگین طرز بیان کی حامل تحریر

ہوتی ہے، جس کو پڑھنے سے قاری کے ذہن پر کسی طرح کا بوجھ یا بھار نہیں محسوس ہوتا اور نہ ہی اس کے پڑھنے کے لئے کسی ذہنی ورزش کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے ہلکے پھلکے اور شگفتہ انداز بیان کے سبب قاری اسے پسند کرتا ہے۔ اس میں لفظوں سے سحر طرازی کا کام بھی لیا جاتا ہے ایک اچھے انشائیہ کے مطالعہ سے ہم کچھ دیر کے لئے انشائیہ میں ایسے گم ہو جاتے ہیں کہ ساری دنیا کو بھول بیٹھتے ہیں۔ انشائیہ کا مطالعہ تمام دنیاوی تفکر اور دشواریوں سے چند لمحے کیلئے نجات دلا دیتا ہے، جس سے ذہنی تر و تازگی کا احساس ہوتا ہے اور غیر متوقع سرور و انبساط ہوتا ہے۔ انشائیہ قاری کو ادب کی سنجیدگی سے الگ چند لمحوں کیلئے غیر سنجیدہ فضا میں لا کھڑا کرتا ہے۔

(۵) موضوع کا تنوع:

انشائیہ کی اہم خصوصیات میں سے موضوع کی تازگی، انوکھا پن اور رنگا رنگی بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ انشائیہ نگار ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتا ہے جو روزمرّہ کی زندگی سے مطابقت تو رکھتے ہیں مگر ان پر عام لوگوں کی نظریں کم پڑتیں ہیں یا نہیں پڑتی ہیں اس لئے وہ ایسے نظر انداز موضوعات کو انشائیہ کے ذریعہ پھر سے منور و تر و تازہ کرتا ہے۔ موضوع کی شادابی ہی انشائیہ کی روح ہے۔ وہ موضوع کے پامال گوشے پر اپنی ذات کے حوالے سے بات سے بات پیدا کرتا ہے، جس سے قاری کو مسرت کا احساس ہوتا ہے انشائیہ کا دار و مدار موضوعات پر ہے۔ انشائیہ نگار بہ ذاتِ خود آزاد ہوتا ہے اور انشائیہ تحریر کرتے وقت نہ اس کے ذہن میں کوئی خاکہ یا پلاٹ ہوتا ہے اور نہ اس کے پس پردہ کوئی اصلاحی مقصد بلکہ وہ ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے اور اس آزادی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی ایک انشائیہ میں مختلف موضوعات کو قلم بند کرتا ہے اور اس کے انوکھے پہلو پر قلم فرسائی کرکے قاری کے علم میں اضافہ کرتا ہے مگر اس میں علمیت نہیں ہوتی بلکہ طرزِ بیان کچھ ایسا ہوتا ہے کہ لفظوں سے تانے بانے بنتا چلا جاتا ہے وہ رعایت لفظی سے بھی کام لیتا ہے وہ مختلف موضوعات کا بیان اس خوبی سے کرتا ہے کہ قاری کا ذہن یکے بعد دیگر تمام موضوعات کو تسلیم کرتا چلا جاتا ہے اور اسے اس میں کہیں بھی کوئی جھول محسوس نہیں ہوتا موضوع کا تنوع انشائیہ نگار کی شخصیت کا متقاضی ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار اپنی ذہنی اختراع سے خشک موضوع میں بھی اپنے طرزِ بیان سے جان ڈال دیتا ہے کہ قاری اس کو بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہے۔ انشائیہ نگار ہر موضوع پر کھل کر بات کرنے کا عادی ہوتا ہے وہ چاہے تو حیات و موت کی بات کرے، زمانہ و کائنات کو اپنا موضوع

بنائے کبھی ماضی میں لے جائے تو کبھی حال میں رکھے یا مستقبل کو ٹٹولے، زندگی اور اس کے مسائل کی نقاب کشائی کرے خواہ کسی مقصد کے تحت ہو یا بے مقصد۔ انشائیہ کے وضع کردہ آداب کے تحت انشائیہ نگار پر یہ پابندی نہیں ہے کہ وہ کیا کہے گا اور کیا نہیں کہے گا۔ اسی لئے اسے ذہن کی آزاد ترنگ کا ترجمان کہا جاتا ہے انشائیہ نگار کیلئے سات خون معاف کرنے کی بات بھی مثال کے طور پر کہی جاتی ہے۔

(۶) زبان و بیان میں بانکپن اور اختصار

انشائیہ میں تصنع کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے مگر انشائیہ نگار مقفیٰ و مسجع جملے تحریر کرنا شروع کر دے تو انشائیہ میں بوجھل پن پیدا ہو جاتا ہے جس سے قاری کی دلچسپی میں خلل پڑتا ہے اور یہی انشائیہ کے زوال کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لئے انشائیہ میں زبان و بیان پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ انشائیہ نگار کو زبان پر قدرت حاصل ہو اور وہ منفرد اسلوب یا طرزِ تحریر کا مالک بھی ہو۔ انشائیہ میں کسی قسم کی بناوٹ، تصنع تکلف یا رکھ رکھاؤ سے اس کی بے تکلفی ہرن ہو جاتی ہے۔ انشائیہ کی روح اسکی بے تکلفی اور غیر منطقی ربط ہے۔ اس لئے انشائیہ میں سادہ، صاف، شستہ، سلیس اور بے ساختہ زبان یا اسلوب بیان کے استعمال سے انشائیہ کا انوکھا پن برقرار رہتا ہے۔ انشائیہ کی ایک اہم خوبی اسکا اختصار ہے۔ اختصار پر کافی اختلاف ہے کچھ لوگ اختصار سے مراد صفحوں یا سطروں کی تعداد سے لیتے ہیں تو کچھ لوگ موضوع کے اختصار کی بات کرتے ہیں لیکن انشائیہ کا اختصار میری سمجھ سے وہی ہے جو غزل کا اختصار ہے۔ غزل میں ایجاز و اختصار کو روا رکھا جاتا ہے مگر غزل کے اشعار میں تعداد کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے ٹھیک ویسے ہی انشائیہ میں اختصار سے مراد زبان و بیان کا بانکپن ہے اگر عمدہ اور کم الفاظ میں کسی بات کو اچھے ڈھنگ سے پیش کر دیا جائے۔ جملے چست و درست ہوں، محاورے اور روزمرہ یا لفظوں کی تراکیب سے جملے میں ایک آہنگ کی سی کیفیت پیدا ہو جائے جسے انشائیہ نگار کا اسلوب کہا جاتا ہے۔ اسلوب کی تازگی ہی انشائیہ کی جان ہے جس سے سادگی کو قائم رکھا جائے اور اس سے موضوع کی وضاحت بھی مکمل طور پر ہو جائے۔ انشائیہ میں انکشافِ ذات ہوتا ہے اسلئے ذات یا شخصیت سے مسخ ہونے کے بعد موضوع میں کافی تبدیلی آجاتی ہے مصنف کی شخصیت اور مطالعے کی وسعت سے مطابقت رکھتے ہوئے کسی موضوع کے تمام گوشوں کو منور کیا جائے۔ موضوع خواہ خشک ہو یا معنی آفریں اس کا سارا دارومدار انشائیہ نگار کی ذات پر ہے اس لئے اختصار کا گمان

یہاں بھی لاحق ہوتا ہے کیونکہ بے جا طوالت سے انشائیہ کو بوجھل نہ بنایا جائے بلکہ اس میں دلچسپی برقرار رکھی جائے۔ موضوع سے دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے تشنگی ضروری ہے جو عدم تکمیل سے ممکن ہے۔ عدم تکمیل میں اختصار کی خصوصیت شامل ہے اس لئے زبان و بیان میں بانکپن نہ ہوگا تو انشائیہ نگاری کا حسن برقرار نہیں رہ سکتا ہے کیونکہ انشائیہ نگاری کا معاملہ مکمل طور پر زبان بیان اور اسلوب بیان یا طرزِ نگارش کا ہے۔ اس لئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ زبان و بیان اور اسلوب بیان میں بانکپن اور اختصار دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں کے بغیر انشائیہ کی تخلیق کار محال ہے اس لئے انشائیہ نگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے زبان و بیان پر قدرت حاصل ہو اور موضوع کو اختصار سے واضح کرنے کی صلاحیت بھی انشائیہ نگار میں ہو، تا کہ ترشے ترشائے جملے اور نپی تلی تحریر میں اسلوب کا جادو اختصار کے ساتھ سرچڑھ کر بولے۔

(۷) بے بات سے بات پیدا کرنا:

بے بات سے بات پیدا کرنا سے مراد مرکزی بات سے کچھ ضمنی باتوں کا تانا بانا بننا ہے یعنی مختلف موضوعات سے رشتہ استوار کرنا ہے۔ انشائیہ نگار جب انشائیہ تخلیق کرتا ہے تو اس کے ذہن میں انشائیہ کا کوئی خاکہ نہیں ہوتا نہ ہی کسی خاص مقصد اور خیال کو لیکر انشائیہ لکھا جاتا ہے بلکہ انشائیہ زبان کی جادوگری ہے جو لفظوں کا جامہ پہن کر صفحۂ قرطاس پر بکھر جاتا ہے۔ یہ ذہن کی آزاد ترنگ ہوتی ہے اس لئے اس میں بے ربطی بھی ہوتی ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر انشائیہ نگار کسی بھی بات سے بات شروع کرتا ہے اور لکیر کا فقیر بنے بغیر کبھی ایران تو کبھی توران کی سیر کرتا ہے جس کے سبب وہ کسی ایک بات سے کئی دوسری چھوٹی چھوٹی بحثیں اٹھاتا ہے نکتے ابھارتا ہے اور زندگی کے کئی پہلوؤں پر بیک وقت روشنی ڈالتا ہے لیکن وہ موضوع کی مرکزیت کا خاص خیال رکھتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ بات سے بات پیدا کرتا چلا جاتا ہے بلکہ بے بات کی بات میں کچھ پتے کی بات بھی کہہ جاتا ہے جس کی وجہ سے کسی نے اسے حکمت سے لیکر حماقت اور مہملیت و مجہولیت تو کسی نے قلم کار کی گپ کہا ہے جس میں مرکزی بات سے کچھ ضمنی بات نکلتی چلی جاتی ہے۔

(۸) شخصی ردِّعمل:

ادب سماج کا آئینہ ہے اس لئے سماج جیسا ہوگا ادب بھی ویسا ہی ہوگا۔ انشائیہ ادب کی واحد صنف ہے جس میں غیر سنجیدگی اور بے ربطی کے سبب تخلیق کار اپنے دل کی بات کا اظہار کر دیتا ہے۔ انشائیہ کی بے ربطی اور بے بات کی بات میں جو بھی بات بیان کی جاتی ہے وہ تمام باتیں ہمارے اردگرد یا سماج سے مستعار لی جاتی ہیں۔ انشائیہ نگار اپنی تیسری آنکھ سے دنیا کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے اور اسی زاویہ کے بدلے میں یا شخصی ردِّعمل کے طور پر انشائیہ وجود میں آتا ہے جس میں سماج اور معاشرے کے کسی پامال گوشے یا مخفی مفاہیم کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس سے قاری کو روشناس کرایا جاتا ہے۔ انشائیہ سماج کا آئینہ نہیں ہوتا بلکہ انشائیہ سماجی ردِّعمل کا آئینہ ہوتا ہے کسی بھی انشائیہ میں عصری آگہی ضروری ہے جس کی بنیاد پر قاری یہ سمجھ پاتا ہے کہ انشائیہ نگار کیا کہنا چاہتا ہے۔ انشائیہ کے بارے میں یہ بات عام طور سے دہرائی جاتی ہے کہ یہ نہ دیکھو کہ کیا کہا گیا ہے بلکہ یہ دیکھو کیسے کہا گیا ہے۔ اس میں شخصی ردِّعمل کی کارفرمائی جلوہ گر ہوتی ہے جو عموماً سادہ اور سلیس انداز میں سماج کی کمزوریوں اور بدعنوانیوں کی طرف توجہ مرکوز کراتی ہیں جسے شخصی ردِّعمل کہا جاتا ہے انشائیہ میں جو بات بھی کہی جاتی ہے اس میں نہ کوئی بناوٹ ہوتی ہے نہ کہیں تصنع کا تعلق، بلکہ کوئی شخص اپنے انفرادی انداز میں اپنی ذات کو تحریر میں دخیل بناتے ہوئے انشائیہ تخلیق کرتا ہے اسی لئے اسے شخصی ردِّعمل بھی کہتے ہیں۔

۹۔ دعوتِ فکر:

انشائیہ میں آزادہ روی ہونے کے سبب انشائیہ نگار زندگی کی حقیقتوں کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور قاری کو ایک نئے انداز سے دیکھنے کی دعوت دیتا ہے وہ موضوع یا مظہر کے مخفی مفاہیم تک خود غوطہ لگاتا ہے اور قاری کو بھی غوطہ لگا کر موتی نکالنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ جب انشائیہ کا قاری انشائیہ میں غوطہ لگائے گا تو اس پر مختلف حقائق آئینہ ہونگے اور اس کے ذہن کے بند دریچے کھلیں گے جس سے وہ اپنا نظریہ اخذ کر سکتا ہے وہ موضوع کے مختلف پہلوؤں کی تحقیق اپنے طور پر کر کے اپنے مشاہدے اور تجربات ومحسوسات کی بنیاد پر کوئی رائے قائم کرتا ہے۔ اس لئے انشائیہ نگار کسی بھی موضوع کے صرف ایک یا دو پہلو کی طرف سرسری اشارہ کر کے

قاری کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔ قاری جب اپنے انداز سے الٹ پلٹ کر اور اس کا زاویہ بدل کر خود اپنی جگہ سے ہٹ کر، سر کے بل چل کر، کسی کمین گاہ میں بیٹھ کر، کیچڑ میں لتھڑ کر یا ٹانگوں میں سر ڈال کر اس موضوع پر نظر ڈالتا ہے تو وہی موضوع اسے بالکل انوکھا لگنے لگتا ہے اور روزانہ کا دیکھا بھالا منظر آج قاری کو نیا معلوم ہونے لگتا ہے جس سے اس کو مسرّت کا احساس بھی ہوتا ہے اور غور وفکر کی ترغیب وتحریک بھی ملتی ہے۔ اسی تحریک کے پیشِ نظر وہ پھر سے اس موضوع کے چند مخفی گوشوں کی ازسرِ نو تحقیق کرتا ہے اس لئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ انشائیہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ قاری کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔

اردو انشائیہ کی روایت احمد جمال پاشا تک:

گزشتہ صفحات کی تفصیلی بحث سے چند نکتوں کی نشاندہی ہوئی جس سے یہ بات واضح ہوئی کہ انشائیہ کیا ہے اور انشائیہ کی روایت کہاں سے شروع ہوتی ہے اس کی خصوصیات کیا ہیں۔ سرسری طور پر اردو انشائیہ کا پس منظر بیان کر کے عہد بہ عہد اس کی تفصیل احمد جمال پاشا تک پیش کرنے سے انشائیہ کی حقیقی صورتحال کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکے گا۔ اردو انشائیہ کے موجد کے بارے میں جو بحث ہوئی اس سے یہ بات واضح نہ ہو سکی مگر باضابطہ اور شعوری طور پر اردو انشائیہ کی شروعات اختر اورینوی کے اس مقدمے سے ہوئی جو شاہ علی اکبر قاصد کے انشائیوں کے مجموعے ''ترنگ'' پر ۱۹۴۵ء میں پہلی بار لکھا گیا مگر یہ حتمی فیصلہ نہیں کہ انشائیہ کی شروعات ترنگ سے ہوتی ہے بلکہ ترنگ کے وجود میں آنے سے قبل بھی مختلف ترنگیں موجود تھیں۔ جسکی تحقیق رفتہ رفتہ ہوئی پھر بھی اردو انشائیہ کے بارے میں کوئی بھی بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی گئی جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اردو انشائیہ کے محققین نے اکثر وبیشتر اس بحث سے اپنے آپ کو دور رکھنے کی کوشش کی۔ باوجود اس کے جو بھی بحث چھڑی اس میں بھی جانبداری کا دخل رہا جس کی وجہ سے کسی نے واضح طور پر یہ کہنے کی جرأت نہیں کی کہ اردو انشائیہ کا موجد کون ہے؟ پھر بھی غیر جانبدارانہ نظر ڈالنے پر یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ انشائیہ کے خدوخال کی واضح طور پر پہچان بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں ہوئی مگر اردو انشائیہ کی ابتداء اس کے کافی عرصہ قبل ہوئی یعنی اردو نثر کے ارتقاء کے ساتھ ہی ساتھ اردو انشائیہ کے نقوش بھی دکھائی دیتے ہیں۔

اردو میں ادبی نثر کی حیثیت سے ملا وجہی کی ''سب رس'' کو اولیت حاصل ہے۔ سب رس

میں انشائیہ کی تلاش ڈاکٹر جاوید وششٹ نے کی مگر وہ آدرش پرستی اور دیش پریم کی وجہ سے کافی جذباتی ہوگئے جسکے نتیجے میں وہ ملا وجہی کو اردو انشائیہ کا موجد قرار دیتے ہیں انکی اسی بات سے اختلاف کرتے ہوئے اگر ڈاکٹر سیدہ جعفر کی رائے سے اتفاق کریں تو یہ بات کچھ حد تک واضح ہوجاتی ہے کہ اردو انشائیہ کے ابتدائی نقوش کے چند نمونے ملا وجہی کی تحریروں میں ملتے ہیں جسے انشائیہ نما تحریر کہا گیا ہے۔ انشائیہ کے مکمل نمونے یا واضح شکل ملا وجہی کے یہاں نہیں ملتی کیونکہ سب رس کی ان تحریروں کو جسے جاوید وششٹ انشائیہ کہتے ہیں مولوی عبدالحق نے پند وموعظت کا دفتر کہا ہے اور یہ بات بھی ثابت ہوچکی ہے کہ یہ ملا وجہی کی اپنی تخلیق نہیں بلکہ فتاحی کے ''حسن ودل'' کا ترجمہ وتالیف ہے زبان مقفیٰ اور مسجع ہے اسلوب میں بوجھل پن ہے اس لئے یہ انشائیہ نہیں بلکہ تسلیم شدہ تمثیلی قصہ ہے۔ کہیں کہیں انشائیہ نما تحریریں موجود ہیں مگر صرف ان تحریروں کی بنیاد پر ہم انشائیہ کا سلسلہ ملا وجہی تک نہیں جوڑ سکتے ہیں۔ یہاں سے انشائیہ نما طرز تحریر کی شروعات ہوتی ہے اور یہ انشائیہ کے لئے نیک فال تسلیم کئے جاسکتے ہیں۔

ملا وجہی اور ان کے معاصرین کا عہد اردو زبان کا ارتقائی عہد تھا۔ رفتہ رفتہ اردو زبان میں وسعت پیدا ہوتی گئی اور اس نے ترقی کے مدارج طے کرنا شروع کردیئے۔ ملا وجہی سے لیکر میر امن کے نثری اسلوب تک جا بجا انشائیہ نما تحریریں یا چند انشائی نقوش ملتے ہیں فورٹ ولیم کالج کے تحت اردو نثر عام فہم سادہ اور دلکش ہونے لگی۔ مختلف موضوعات پر تحریریں بھی منظر عام پر آنے لگیں مثلاً حیدر بخش حیدری کی ''آرائش محفل'' میں مختلف تعریفیں۔ فورٹ ولیم کالج کے باہر دہلی اور لکھنؤ میں بھی نثر لکھی جا رہی تھی۔ ماسٹر رام چندر، فقیر محمد گویا، غلام امام شہید اور غلام غوث بے خبر وغیرہ نے اردو نثر میں مزید اصلاح کر کے اسے عام فہم بنایا مثلاً غلام امام شہید کی ''انشائے بہار بے خزاں''۔ اردو نثر کی نشوونما کے عہد میں اردو کے جو ابتدائی نقوش ملتے ہیں ان میں جدت، ندرت اور بیان کا انوکھا پن نظر آتا ہے جیسے جیسے اردو نثر ترقی کرتی گئی ویسے ویسے اردو انشائیہ کی راہیں ہموار ہوتیں گئیں۔ رفتہ رفتہ انشائیہ اور مضمون کی خلط ملط اور متعدد بیانات یا جتنے منہ اتنی باتیں سامنے آنے لگیں کسی نے انشائیہ کہا تو کسی نے مضمون مگر یہ بحث تشنہ تعبیر اور خواب پریشان بن کر رہ گئی۔ ماسٹر رام چندر سے اردو میں مضمون نگاری کے ابتدائی نقوش ڈھونڈے گئے اور بعد میں چند حضرات اس کے برعکس سرسید احمد خاں کو اردو انشائیہ کا موجد قرار دینے لگے۔ لیکن سرسید احمد خاں نے جو تحریریں چھوڑی ہیں ان کا اگر ہم بغور جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آئے گی کہ سرسید کی تحریریں کسی سوچی سمجھی ہوئی اصلاحی اسکیم

کے تحت منظر عام پر آئیں۔ ایڈیسن اور اسٹیل کے طرز پر اردو میں ''تہذیب الاخلاق'' کا اجراء کیا اس میں اصلاح معاشرہ کو ترجیح دی۔ اس دور میں جو بھی تحریریں منظر عام پر آئیں ان کا مقصد قوم ومعاشرے کی اصلاح تھا وہ مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی کے سلسلے میں لکھی گئی تھی۔ انداز خطیبانہ تھا۔ موضوعات میں بے ربطی یا غیر سنجیدگی نہ تھی بلکہ سنجیدہ مضامین کسی خاص موضوع پر لکھے جا رہے تھے۔ اسلوب سادہ اور شگفتہ تھا مگر تازگی نہ تھی بلکہ تکرار غالب تھی اس لئے اگر ہم سرسید کے مضامین سے بحث کرتے وقت گزشتہ صفحات پر ہوئی بحث کو نظر میں رکھیں تو یہی رائے قائم ہوگی کہ سرسید نے علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو مضمون نگاری کو کافی وسعت دی اور اسے بلندی پر پہنچادیا۔ سرسید کے رفقاء میں مولوی ذکاءاللہ دہلوی جو ماسٹر رام چندر کے شاگرد بھی تھے اچھی طرز تحریر یا اسلوب کے لئے جانے جاتے تھے انکا ایک مضمون ''آگ'' مثال کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ رفقائے سرسید کے دوسرے رکن بھی اس تحریک میں پیش پیش رہے۔ تفصیل کی نہ یہاں گنجائش ہے اور نہ اس سے کوئی خاص فائدہ ہے بلکہ صرف سرسری طور پر اشارہ کرنا میرا مقصد ہے الطاف حسین حالؔی اور محمد حسین آزاد دو ایسے نام ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ حالی نے شاعری کی تنقید لکھی، سوانح لکھی، اور چند مختصر مگر اچھوتے مضامین لکھے۔ ناصحانہ انداز، سنجیدگی اور اصلاحی نقطۂ نظر کے تحت انہیں بھی اچھا نثر نگار یا مضمون نگار کہا جاسکتا ہے مگر یہ بھی انشائیہ نگار نہ تھے۔ محمد حسین آزاد نے کافی حد تک کوششیں کیں۔ انشاپردازی کا عمدہ نمونہ ''نیرنگ خیال'' میں پیش کیا جسے آزاد کے انشائیوں کا مجموعہ کہا جاتا ہے جس کا انداز تمثیلی اور مبہم ہے جسے انگریزی سے ترجمہ کیا ہے مگر آزاد نے اپنے انشاپردازانہ انداز و اسلوب کے استعمال سے اسے اپنی تخلیق بنا لیا ہے۔ انداز بیان انوکھا ہے طرز تحریر شگفتہ ہے موضوعات کی بے ربطی ہے مگر انداز ڈرامائی ہے قصہ پن کا گمان ہوتا ہے جو انشائیہ کی خصوصیات سے بالکل الگ ہیں۔

سرسید اور ان کے رفقاء کی یا ان کے عہد کی تحریروں میں انشائیہ کے چند نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں مگر یہ سب کچھ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر ہو رہا تھا جس کا مقصد خالص اصلاح قوم تھا تا کہ مسلمانانِ ہند کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا جاسکے اور وہ امور مملکت میں حصہ لے سکیں۔ اسی عہد میں اس کے ردعمل کے طور پر اودھ پنچ'' کی شروعات ہوئی جس میں طنز ومزاح کا سہارا لے کر نثر ونظم میں طنز و مزاح کی راہیں ہموار کیں جس سے انشائیہ کی نشوونما میں کافی مدد ملی۔ اس عہد کے مشہور قلم کاروں کے نام ہیں منشی سجاد حسین، محفوظ علی، تربھون ناتھ ہجر'' سید محمد آزاد وغیرہ سرسید احمد کے بعد کے عہد

میں رومانوی تحریک عمل میں آئی جس میں ادب برائے ادب نے انگریزی کے تحت زور پکڑا جس سے ادب لطیف کا وجود عمل میں آیا۔ اس کے تحت سجّاد انصاری، مہدی افادی، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور عبدالحلیم شرؔر وغیرہ نے اردو نثر کو ایک نئی جہت عطا کی۔ ادب لطیف جسے انشائے لطیف بھی کہتے ہیں اس طرز تحریر کو دانشوروں نے ٹیگوریت اور نیازیت سے بھی موسوم کیا۔ اس دور میں ایک خاص اسلوب اور مخصوص لب ولہجہ کا چلن عام ہوا جس میں اکبر حیدری کی ''کیفستان'' نیاز فتح پوری کی ''خیالستان'' اور ''نگارستان'' اور آصف علی کی ''پرچھائیاں'' وغیرہ اس اسلوبِ خالص کی بہترین مثال ہیں۔ یہ اسلوب ادب میں دیرپا ثابت نہ ہوسکا مگر اردو انشائیہ کے اسلوب سے یہ کافی قریب تھا۔ اسلوب کی تازگی کو انشائے لطیف سے ہی مستعار لیا گیا ہے جو انشائیہ میں خاص اہمیت کا حامل ہے اس اسلوب نگارش نے انشائیہ نگار کیلئے انشا پردازی کے جو نمونے پیش کئے وہ بلا شبہ انشائیہ کے حق میں ثابت ہوئے۔ عبدالحلیم شرر کا ''نسیم سحر'' آرزو'' غریب کا جھونپڑا'' لالہ خودرو'' اور سجاد حیدر یلدرم کا ''چاندی کی کیفیت'' بھولی بسری یادیں'' اور ''حضرتِ دل کی سوانح عمری'' وغیرہ میں اسلوب کی تازہ کاری کے شاہکار نمونے ملتے ہیں۔ ادبِ لطیف کے دور کے بعد جو دور آیا وہ اردو انشائیہ کیلئے کافی مددگار ثابت ہوا۔ اس دور کے مخصوص ادیب میاں بشیؔر ناصر علی اور خلیؔقی دہلوی وغیرہ ہیں۔ ناصر علی کو نیاز فتح پوری نے اردو انشائیہ کا موجد کہا ہے۔ ناصر علی اخبار ''صدائے عام میں'' خیالات پریشان'' کے عنوان سے لکھتے تھے۔ جس میں موضوع کا تنوع اور مختلف مضامین پر بہ یک وقت قلم فرسائی کرتے جو مغربی تہذیب پر ضرب کاری ہوتی۔ ''چرخ شعبدہ بازی'' ان کا ایک اچھا انشائیہ ہے۔ خلیؔقی دہلوی نے بھی اردو انشائیہ کی روایت کو آگے بڑھایا۔ حریص رقص ''درۂ موت'' باسی ہار'' کیفِ نظر'' اور میرا سفر'' وغیرہ ان کے معیاری انشائیے ہیں۔ یوسف بخاری، عبدالعزیز فلک پیا، اور خواجہ حسن نظامی وغیرہ بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کا نام کافی اہم ہے ان کے انشائیوں میں ''جھینگر کا جنازہ'' دیا سلائی'' '' اُلّو'' اور تمبا کو نامہ'' وغیرہ کافی معیاری ہیں۔ ''سی پارۂ دل'' ان کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔

اردو انشائیہ میں مضمون نگاری کے ساتھ ساتھ طنز ومزاح نگار بھی کافی تعداد میں منظرِ عام پر آئے۔ جن کے طنز ومزاح اور مضامین کے چرچے ہوتے تھے۔ اردو انشائیہ میں کچھ انشائیہ نگار ایسے ہیں جنھیں شہرت طنز نگار یا مزاح نگار کی حیثیت سے ملی مگر ان کے یہاں طنز ومزاح کے ساتھ انشائیہ کا رجحان بھی پایا جاتا ہے جو شعوری یا لاشعوری طور پر ان کی تحریر وتصنیف میں اکثر وبیشتر نظر آتا ہے۔

جن میں بالخصوص فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، انجم مانپوری، شوکت تھانوی، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، فرقت کاکوروی، کنہیالال کپور، فکر تونسوی، ابراہیم جلیس، یوسف ناظم، جوگندر پال اور مجتبیٰ حسین وغیرہ ہیں جنھوں نے طنز ومزاح کو اپنا میدان مانا اور اسی میں وہ اپنی شعوری کوششیں کرتے رہے مگر آہستہ آہستہ جب طنز ومزاح کی کالی گھٹا کم ہوئی اور آسمانِ ادب پر اردو انشائیہ نگاری کا مطلع صاف ہوا تو سبھی نے اردو انشائیہ کو گلے لگایا۔ طنز ومزاح کی چٹ پٹی زبان کو سادہ سلیس اسلوب سے معطر کیا اور اردو انشائیہ کی تحریک میں شامل ہوگئے۔ رشید احمد صدیقی نے جو بھی تحریریں چھوڑیں ہیں انھیں بعد میں مالِ غنیمت سمجھ کر عزیز اقرباء نے بانٹ لیا اردو انشائیہ کے ناقدین بھی اس میں پیچھے نہیں رہے اور رشید احمد صدیقی کے مضامین رشید سے کچھ چیزیں اپنے قبضہ میں کر لیں۔ جو اردو انشائیہ کے معیار اور میزان پر بالکل پوری اتری۔ مثلاً ارہر کا کھیت'' جس کی مثال ملنا مشکل ہے مگر ڈاکٹر وزیر آغا نے ایسی نظر پھیری کہ ان کو بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے قبل انشائیہ کی طرح کی کوئی بھی تحریر نظر ہی نہیں آئی۔ اسلئے انھوں نے خود یہ کوشش شروع کی۔ میں نے اس کتاب میں صرف ہندوستان کے انشائیہ نگاروں تک ہی خود کو محدود رکھا ہے اسلئے پاکستانی انشائیہ نگاروں کی بات کرنا بے محل ہوگا۔

طنز ومزاح کے علاوہ بھی کچھ لوگ اپنی شناخت انشائیہ نگاری کے میدان میں ہی بنا رہے تھے مثلاً شاہ علی اکبر قاصد جن کا مجموعہ ''ترنگ'' پہلی بار شعوری طور پر انشائیہ کی بنیادی حیثیت کا حامل ہوا جو اردو انشائیہ کا سنگ میل بھی ہے۔ سید محمد حسنین عظیم آبادی جن کے انشائیوں کا مجموعہ ''نشاطِ خاطر'' کی شکل میں اور ان کے تنقیدی جوہر فن انشائیہ پر ''صنف انشائیہ اور انشائیے'' منظرِ عام پر آئے۔ ان کے علاوہ رام لعل نابھوی، یوسف ناظم، جاوید وششٹ، نریندر لوتھر، اعجاز علی ارشد اور مجتبیٰ حسین وغیرہ نے انشائیہ نگاری کے فن کو فروغ دیا۔ جس میں احمد جمال پاشا بھی ان کے ساتھ ساتھ انشائیے اور تنقیدی مضامین لکھ کر انشائیہ کے فن پر روشنی ڈالتے رہے۔

احمد جمال پاشا تک اردو انشائیہ کی روایت قائم کرنے میں سرسید کے بعد ان کے رفقاء پھر ترقی پسند تحریک کے طنز ومزاح نگار، آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد تمام صاحب قلم حضرات نے اپنے اپنے طور پر مضمون وانشائیے لکھ کر اس روایت کو آگے بڑھایا جس کو تفصیل سے بیان کرنے کی گنجائش نہیں بلکہ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ احمد جمال پاشا نے اردو انشائیہ کی روایت کو جہاں چھوڑا تھا ہندوستان میں اس میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہ ہوا۔ پاشا کے انتقال کے بعد کوئی نیا نام اردو انشائیہ

نگاری کے ضمن میں نہیں لیا جا سکتا۔ دورِ پاشا میں انشائیہ کی آخری کڑی مجتبیٰ حسین تھے اور تا حال وہ اردو انشائیہ کی نوک و پلک کبھی کبھار درست کر دیتے ہیں کوئی ایسا نام نہیں ابھرا جس نے انشائیہ نگاری کی طرف سنجیدگی سے رخ کیا ہو اور اس کی حمایت کی ہو بلکہ پاشا کے دور میں انشائیہ کی جو روایت رہی ہے آج بھی وہ روایت قائم ہے دیگر اصناف ادب سے تعلق رکھنے والے ادیب ہی گاہے بہ گاہے انشائیہ نگاری کی محفل میں شامل ہو کر اس صنف کو پائیداری اور حسن عطا کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستانی تناظر میں اردو انشائیہ نگاری کو اسی اعتبار سے دیکھنا ہوگا نہ کہ سات سمندر پار بیٹھ کر اپنا فرمان جاری کرنا ہوگا اسلئے ہندوستان میں انشائیہ نگاری کے زمرے میں جو کچھ بھی ہے تسلی بخش اور تشفی بخش ہے اسے سرے سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا انشائیہ کا منکر بن کر کچھ بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا بلکہ اسی ذخیرے سے کار آمد شئے تلاش کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے تاکہ آئندہ محرومی و مایوسی کا شکار نہ ہونا پڑے ہمیں اپنے میزان پر انشائیہ کو پرکھنے کے بجائے فن کے میزان پر انشائیہ کو پرکھنا ہوگا۔ تبھی کوئی معنی خیز نتیجہ سامنے آسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی

نمبر	حوالہ	صفحہ
۱	اردو مضمون کا ارتقاء، سیدہ جعفر، نیشنل فائین پرنٹنگ پریس حیدرآباد ۱۹۷۲ء	دیباچہ
۲	اردو انشائیہ، سید صفی مرتضیٰ، نسیم بک ڈپو، لکھنو ۱۹۶۱ء	۹
۳	ادب کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر سلام سندیلوی، فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۵۹ء	۱۹۹
۴	نشاطِ خاطر، ڈاکٹر سید محمد حسنین، دائرہ اردو، گیا۔ ۱۹۸۰ء	۷
۵	ماہنامہ ''نیا دور'' لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۶۱ء	۲۹
۶	ماہنامہ ''کتاب نما، نئی دلّی، اکتوبر ۱۹۸۳ء	۳۱
۷	انشائیہ کے خدوخال، ڈاکٹر وزیر آغا، مکتبۂ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۹۰ء	۲۶
۸	مُلّا وجہی کے انشائیے، ڈاکٹر جاوید وشسٹ، بک سروس، دہلی ۱۹۷۲ء	۹
۹	مُلّا وجہی کے انشائیے، ڈاکٹر جاوید وشسٹ، بک سروس، دہلی ۱۹۷۲ء	۷۹
۱۰	ترنگ، سید شاہ علی اکبر قاصد، مکتبۂ خیال، سبزی باغ، پٹنہ، ۱۹۴۴ء	مقدمہ
۱۱	صنفِ انشائیہ اور انشائیے، ڈاکٹر سید محمد حسنین، ایوان اردو، پٹنہ ۱۹۵۸ء	مقدمہ
۱۲	انشائیہ کے خدوخال، ڈاکٹر وزیر آغا، مکتبۂ فکر و خیال، لاہور ۱۹۹۰ء	۸۰
۱۳	ماہنامہ ''کتاب نما'' نئی دلّی، نومبر ۱۹۸۳ء	۳۵
۱۴	اوراق لاہور، ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۰ء	۱۳۲

۱۵۔ انشائیہ کے خدوخال، ڈاکٹر وزیر آغا، مکتبۂ فکروخیال، لاہور ۱۹۹۰ء — ۴۶

۱۶۔ انشائیہ کے خدوخال، ڈاکٹر وزیر آغا، مکتبۂ فکروخیال، لاہور ۱۹۹۰ء — ۷۹

۱۷۔ ماہنامہ ''کتاب نما'' نئی دلّی، نومبر ۱۹۸۳ء — ۳۷

۱۸۔ ماہنامہ ''کتاب نما'' نئی دلّی، نومبر ۱۹۸۳ء — ۳۹

۱۹۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ، ڈاکٹر نصیر احمد خاں، اردو اکادمی، دہلی ۱۹۹۳ء — ۱۵

۲۰۔ انشائیہ کے خدوخال، ڈاکٹر وزیر آغا، مکتبۂ فکروخیال، لاہور ۱۹۹۰ء — ۸۰

۲۱۔ ماہنامہ ''کتاب نما'' نئی دلّی، نومبر ۱۹۸۳ء — ۳۹

۲۲۔ ماہنامہ ''کتاب نما'' نئی دلّی، دسمبر ۱۹۸۸ء — ۷۸

۲۳۔ اردو مضمون کا ارتقاء، ڈاکٹر سیدہ جعفر، نیشنل فائن پرنٹنگ، پریس حیدرآباد ۱۹۷۲ء — ۱۳/۱۴

۲۴۔ اردو کا بہترین انشائی ادب، ڈاکٹر وحید قریشی، مکتبۂ میری لائبریری، لاہور ۱۹۸۸ء — ۲۲

۲۵۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر سلام سندیلوی، فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۵۹ء — ۲۰۴

۲۶۔ شہرت کی خاطر، نظیر صدیقی، کتاب گھر، ڈھاکہ ۱۹۶۱ء — ۱۵

۲۷۔ اوراق لاہور، مارچ اپریل ۱۹۷۲ء — ۱۹۵

۲۸۔ صنفِ انشائیہ اور انشائیے۔ ڈاکٹر محمد حسنین۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۰ء — جابجا

۲۹۔ انشائیہ کے خدوخال، ڈاکٹر وزیر آغا، مکتبۂ فکروخیال، لاہور ۱۹۹۰ء — جابجا

۳۰۔ انشائیہ کی بنیاد۔ ڈاکٹر سلیم اختر۔ شانِ ہند، نئی دلّی۔ ۲۔ ۱۹۸۶ء — ۱۲۸

۳۱۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ۔ ڈاکٹر نصیر احمد خاں، اردو اکادمی، دہلی ۱۹۹۳ء — ۱۲

دوسرا باب

احمد جمال پاشا......شخصیت اور فن

احمد جمال پاشا......شخصیت اورفن

اردو میں غیرافسانوی نثر کے حوالے سے احمد جمال پاشا کا نام تعارف کا محتاج نہیں ہے لیکن کسی اہلِ فن اور اہلِ کمال کے انتقال کے بعد صرف خصوصی نمبر نکال کر اہل قلم سے دامن جھاڑ لینا ہی بجی خراج عقیدت نہیں بلکہ یہ اردو ادب کا المیہ ہے۔ اس لئے اہل فن کا ذکر جاری رہنا چاہیے۔ کوئی بھی فنکار اہلِ نظر کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو عام قاری فکر مند ہوتا ہے۔ کبھی کبھی چاہتے ہوئے بھی کسی اہل فن کے بارے میں اگر قاری کچھ جاننا چاہتا ہے تو اسکی تفصیل بھی میسّر نہیں ہوتی یہ اسی خلاء کو پر کرنے کی ایک حقیری کوشش ہے۔ احمد جمال پاشا کی شخصیت اور فن پر اس مختصر سے مضمون میں جو کچھ بھی دستیاب ہو سکا اسے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں تا کہ ان کے تحریری محاسن کو پیش کر سکوں۔ قبل اس کے کہ احمد جمال پاشا کے فن پر خامہ فرسائی کروں بہتر یہ ہوگا کہ پاشا کی شخصیت پر ایک سرسری نظر ڈالتا چلوں تا کہ ایک مختصر سوانحی تعارف بھی پیش ہو جائے۔

احمد جمال پاشا کا اصل نام آغا محمد نزہت پاشا تھا لیکن ادبی دنیا ان کو احمد جمال پاشا کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ آغا محمد نزہت پاشا سے احمد جمال پاشا تک کی تفصیل دستیاب نہیں ہے۔ لیکن قیاس ہے کہ آغا محمد نزہت پاشا ساتھ ہی ساتھ جمال بھی تھے یعنی احمد جمال پاشا کی عرفیت یا پیار کا نام جمال تھا۔ بچپن سے ہی گھر کے سبھی افراد جمال کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ خاندانی حالات بہت کم دستیاب ہونے کی وجہ سے مکمل طور پر انکے حالات زندگی کی تفصیل بیان کرنا مشکل ہے۔ چند مضامین کی مدد سے جو امکانات روشن ہوئے ہیں ان کی بنیاد پر آغا محمد نزہت پاشا اور احمد

جمال پاشا کے متعلق کچھ کہا جا سکتا ہے۔ احمد جمال پاشا کے بھائی اقبال پاشا کے مضمون سے دو اقتباس ملاحظہ فرمائیں جن میں احمد جمال پاشا کے والد ان کے بچپن کی شرارتوں سے تنگ آ کر پروردگار سے اس طرح شکوہ کرتے ہیں۔

''ارے جمال تجھ پر کڑکتی بجلی گرے۔ خدا تو خاموش کیوں ہے؟ اپنی بے آواز لاٹھی سے اس پر آسمان ڈھادے اے ملک الموت تو کہاں ہے۔ جمال تجھ پر قہر خداوندی نازل ہو''(۱)

اسی مضمون میں آگے چل کر اقبال پاشا یوں رقم طراز ہیں:

''یہ تھا میرا پہلا تعارف احمد جمال پاشا سے میری عمر اتنی کم تھی کہ کوئی بات یاد نہ رہنا چاہیے تھی مگر جمال کی پٹائیوں کے وہ دلخراش منظر اتنے ڈرامائی اور پر اثر تھے کہ سارے منظر اور مکالمات سمیت آج تک وہ واقعات کل کی بات معلوم ہوتے ہیں''۔(۲)

گھریلو حوالوں سے الگ اگر احمد جمال پاشا کے بچپن پر تحقیقی نظر ڈالیں تو بھی اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ عرفیت جمال تھا جو آگے چل کر احمد جمال پاشا بن گیا۔ عائشہ صدیقی اپنے مضمون میں محلے کی نوکرانی کا ذکر کرتی ہوئی کہتی ہیں:

''میرے ایک دوست کے گھر ایک خادمہ رحیمن آیا کرتی تھی جو ان کے گھر کام کرتی تھی وہ بہت باتونی تھی اور ان کی شرارتوں کا ذکر کان پکڑ کر کرتی تھی.......... رحیمن بتاتی ارے میں بیٹھی ہی تھی کہ جمال بھیا نے پکارا رحیمن ذرا پے جامہ (Panama) سگریٹ کا پیکٹ تو لے آؤ''۔(۳)

متذکرہ بالا حوالوں سے اس بات کی وضاحت صاف طور پر ہو جاتی ہے کہ جمال گھر میں لاڈ پیار کا نام تھا۔ کیونکہ یہ سبھی واقعات احمد جمال پاشا کے بچپن سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس وقت جمال پاشا اپنے گھر میں قفل شکنی کرتے اس سے جو آمدنی ہوتی اسی سے وہ اپنے بچپن کے شوق کو پورا کرتے تھے یعنی چور ڈاکوؤں کی کہانی کی کتابوں کو خرید کر پڑھتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے مگر ان کی اس حرکت پر گھر کے سارے متحیر تھے۔ جمال کو احمد جمال پاشا بنانے میں انہیں کہانیوں نے بنیاد کے لئے گارے کا کام کیا۔ یہ جنون جو احمد جمال پاشا کو بچپن سے تھا جس کا خمیر ان کے ذہن میں تھا اور کم عمری میں ہی اس نے ان کے ادبی ذوق و دلچسپی کو ظاہر کر دیا۔ علاوہ ازیں آغا محمد نزہت پاشا کی جگہ

تحریری شکل میں احمد جمال پاشا کو خود پاشا نے ۱۹۵۰ء میں متعارف کرایا لیکن گھر کے ماحول میں جمال پاشا کا چرچہ بچپن ہی سے تھا۔

احمد جمال پاشا کے والد کا نام آغا شجاعت حسین پاشا تھا۔ وہ الہ آباد میں جج کے عہدہ پر فائز تھے۔ ۱۹۴۰ء میں اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو کر الہ آباد سے لکھنؤ چلے آئے۔ آباء و اجداد اور شجرۂ نسب کا ذکر چند جملوں میں ان کی تحریر کردہ ''خودنوشت'' میں ملتا ہے۔ سلسلۂ نسب صوفی شاعر ناصر علی سرہندی سے ملتا ہے جو ولی دکنی کے معاصرین میں سے تھے۔ اکثر و بیشتر یہ ذکر ملتا ہے کہ آباء و اجداد تلاش معاش کے سلسلہ میں بنگال سے عظیم آباد میں قیام پزیر ہوئے پھر بعد میں گورکھپور میں سکونت اختیار کرلی مگر آخر میں الہ باد میں آکر آباد ہو گئے۔ جہاں تاریخی اسناد کے مطابق یکم جون ۱۹۳۶ء کو احمد جمال پاشا پیدا ہوئے۔ دوسرے ادیبوں کی طرح احمد جمال پاشا کے سنہ پیدائش میں کافی اختلاف ہے جس کی الگ الگ طور پر ماہرین ادب نے تصدیق کی ہے مگر قبل اس کے پاشا کی تحریر کردہ خودنوشت سے یہ اقتباس ملاحظہ ہوں۔ جس میں انہوں نے خود اپنی سن پیدائش کا ذکر کیا ہے۔

''یکم جون ۱۹۳۶ء کو الہ باد میں پیدا ہوا۔ در اصل یہ سرکاری تاریخ پیدائش ہے۔ میں اس سے چار سال قبل یکم جون ۱۹۳۲ء کو باقاعدہ پیدا ہو چکا تھا۔(۴)

احمد جمال پاشا کی زندگی میں سن پیدائش پر کوئی بحث نہیں چلی نہ ہی کوئی حتمی رائے قائم ہو سکی۔ خود پاشا نے ہی اپنی پیدائش دو۔ دو تحریر کردی اور دونوں کی نوعیت الگ الگ بیان کر کے اس کی تصدیق کردی کہ ایک وہ سال جب وہ پیدا ہوئے مگر ایسا لگتا ہے۔ پیدائش کے چند سال بعد جب اسکول یا مکتب میں داخل ہوئے تو دوسری تاریخ کی ضرورت محسوس کی گئی اسلئے ان کے مطابق پیش کردہ دو تاریخ پیدائش اپنے اپنے طور پر صحیح ہیں مگر یکم جون ۱۹۳۲ء کی کوئی تحریری شہادت نہیں ملتی یہ صرف زبانی ہے اس لئے تعلیمی اسناد کی تاریخ کو ہی فی الحال بنیاد بنایا جائے تو بہتر ہوگا۔ پاشا کے انتقال کے بعد جو بھی مضامین ان پر لکھے گئے یا جو بھی نمبر نکالے گئے سبھی میں پاشا کی تاریخ پیدائش یکم جون ۱۹۳۶ء ہی درج ہے۔ معلم اردو جنوری ۱۹۸۸ء کا مشترکہ نمبر اور نیا دور لکھنؤ کا یاد رفتگان نمبر (حصہ اول مارچ تا ستمبر ۸۸ء) کو حوالے کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے مگر وہیں کتاب نمائی دلی کے جنوری ۱۹۸۹ء کے گوشۂ احمد جمال پاشا میں اعجاز علی ارشد نے پاشا کی سن پیدائش ۱۹۲۹ء قرار دیا

ہے۔ لکھتے ہیں:

''مستند شہادتوں کی بنیاد پر پاشا کا سال پیدائش ۱۹۲۹ء
قرار پایا ہے۔''(۵)

اعجاز علی ارشد نے صرف ایک سطر میں پاشا کا سال پیدائش ۱۹۲۹ء قرار دے دیا ہے اور اسے مستند بتایا لیکن اسکے مستند ہونے کی کوئی دلیل نہیں دی۔ تا کہ اسکی تصحیح کی جا سکے۔ اسلئے بغیر کسی مستند شہادت کے سن میں ترمیم ممکن نہیں۔ پاشا کا سن پیدائش یکم جون ۱۹۳۶ء جو تعلیمی اسناد کے مطابق صحیح ہے پاشا کی پیدائش کے بعد الہ آباد سے منتقل ہو کر ان کا خاندان لکھنؤ آ گیا۔ یہاں کچا احاطہ ''سروری منزل'' میں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ سروری منزل کچا احاطہ امین آباد لکھنؤ، میں احمد جمال پاشا سے قبل جوش ملیح آبادی کے دادا فقیر محمد گویا صفی لکھنوی، ناطق لکھنوی، شوکت تھانوی، اور مجاز رہ چکے تھے۔ شاعری وطنز و مزاح کا خمیر اس گھر کے در و دیوار میں رچا بسا تھا۔ پاشا کے بڑے بھائی اور والد آغا شجاعت حسین پاشا بھی اردو شاعری سے شوق فرماتے تھے۔ گھر کا ماحول ادبی تھا آئے دن ادبی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ شعراء کرام کا ان کے یہاں آنا جانا تھا۔ دوران طالب علمی ہی انکے ادبی زندگی کی شروعات ہو چکی تھی۔ ادبی شوق یا رجحان کی شروعات پہلی بار ۱۹۵۰ء میں ہوئی جب تاریخی اسناد کے مطابق ان کی عمر صرف چودہ سال تھی اور وہ اسکول کے طالب علم تھے ان کا پہلا مضمون ''من چغد بیا بانم'' رسالہ ''راہی'' جالندھر میں شائع ہوا۔ جس کے بارے میں محمد ابراہیم علوی لکھتے ہیں:

''احمد جمال پاشا نے اپنے ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۰ء میں اپنے مزاحیہ
مضمون'' من چغد بیا بانم'' سے کیا جو کہ جالندھر سے شائع ہونے والے ماہنامہ
''راہی'' میں شائع ہوا تھا''۔(۶)

ابراہیم علوی نے پاشا کی ادبی زندگی کے آغاز کے بارے میں جو درج بالا حوالہ دیا ہے اس کو بنیاد نہیں بنا سکتے جس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی ادیب یا شاعر اپنی تخلیق میں جو بیان کرتا ہے وہ اس کی نجی زندگی پر لاگو نہیں ہوتی بلکہ یہ اسکے اسلوب نگارش کی کارستانی ہوتی ہے اس کے تخلیقی ذہن کی اپج ہوتی ہے۔ تخیل کا سہارا لیکر وہ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا دیتا ہے۔ من چغد بیا بانم'' احمد جمال پاشا کا پہلا مزاحیہ مضمون تھا پھر بھی پاشا نے اس کو اپنے کسی مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ اپنے پہلے مضمون کا ذکر اپنے آخری مجموعہ ''پتیوں پر چھڑکاؤ'' میں ایک مضمون لکھ کر کیا ہے۔'' مت پوچھو جب میرا پہلا

مضمون چھپا'' میں وہ فرماتے ہیں۔

''جناب یہ آتش کی جوانی کا قصہ ہے کوئی ۱۹۵۰ء میں میرا پہلا مضمون''
من چغد بیابانم'' راہی'' جالندھر میں چھپا تھا۔''(۷)

اسی مضمون میں پاشا نے احتشام حسین کا بھی ذکر کیا ہے لکھتے ہیں۔

''غرض ہر ایک سے ہم نے اپنا ٹیپ ریکارڈ دہراتے ہوئے التجائے مطالعہ کے ساتھ ''راہی'' کا ایک شمارہ پیش کر دیا۔ احتشام صاحب مسکرائے اور بولے ''راہی'' تو میرے پاس بھی آیا ہے۔ یہ آپ کی پہلی شائع شدہ تخلیق ہے۔ اس لئے اگر آپ برابر لکھتے رہے تو اسکی تاریخی اہمیت ہوگی''(۸)

مذکورہ بالا دونوں حوالوں میں شک کی گنجائش باقی ہے۔ پہلا مضمون چھپنے پر پاشا نے لوگوں سے منت و سماجت کی تا کہ ان کا مضمون پڑھا جائے مگر تضاد یہ ہے کہ پہلے مضمون کا ذکر آخری مجموعے میں کرنا اور مضمون سرے سے غائب۔ دوسرے ادیبوں نے بھی پاشا کے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۵۰ء ہی بتایا ہے۔ اعجاز علی ارشد نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ:

''احمد جمال پاشا کی ادبی اور صحافتی زندگی کا آغاز طالب علمی کے دور سے ہو گیا تھا...... ۱۹۵۰ء سے انھوں نے مزاحیہ مضامین لکھنے شروع کئے۔''(۹)

پروفیسر قاضی عبدالستار بھی اپنے ایک مضمون ''احمد جمال پاشا'' میں لکھتے ہیں:

''۱۹۵۰ء کے بعد جو لوگ خالص مزاح وظرافت کے نثری ادب میں نمایاں ہوئے ہیں ان میں احمد جمال پاشا ممتاز لکھنے والوں میں ہیں۔''(۱۰)

درج بالا دونوں حوالوں کے علاوہ اگر ہم پھر ایک بار احمد جمال پاشا کی تحریروں پر نظر ڈالیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے بھی ادبی زندگی کے ابتدائیہ کا ذکر بنا نمک مرچ لگائے صرف دو جملوں میں کیا ہے۔ مزاح نگار کی خودنوشت ہونے کی وجہ سے زبان کی چاشنی اکثر و بیشتر ملتی ہے پھر بھی اس خودنوشت کو ہم ایک سنجیدہ مضمون مان سکتے ہیں جو قابل اعتبار بھی ہے اور حقیقت سے کچھ قریب بھی۔ ملاحظہ ہو:

''۱۹۵۰ء میں مزاحیہ لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۵۲ء تک ہماری گاڑی ادب کی پٹری پر جو چلی تو اب تک چلتی جا رہی ہے۔'' (۱۱)

تمام حوالوں سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ احمد جمال پاشا نے لکھنا ۱۹۵۰ء سے ہی

شروع کیا۔ جب وہ اسکول کے طالب علم تھے مگر سب سے پہلے کون سا مضمون لکھا اسکی تصدیق نہ ہو پائی ''من چغد بیابانم'' کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ بقول پاشا یہ ان کا پہلا مضمون ہے۔ مگر حتمی طور پر یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ پاشا کا پہلا مضمون وہی ہے جو سب سے پہلے شائع ہوا۔

احمد جمال پاشا نے اسکول کے زمانے سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنا تعلیمی سفر اسلامیہ کالج لکھنؤ سے شروع کیا جو کوئنس، کالج کرسچین کالج سے ہوتے ہوئے لکھنؤ یونیورسٹی تک پہنچا۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔اے۔ کیا جب تک لکھنؤ میں رہے لکھنؤ کی ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے اور اساتذہ کی صحبت میں رہنے کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کا ادبی ذوق دنوں دن نکھرتا چلا گیا۔ ان کا انفرادی اسلوب ہی ان کی شناخت کا سبب بنتا چلا گیا تحصیل علم کا سلسلہ جاری رہا ایم۔اے۔ کرنے کی غرض سے علی گڑھ گئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے۔ کیا دورانِ طالب علمی احمد جمال پاشا نے اس بات کا اکثر خیال رکھا کہ وہی ان کا دوست ہوگا جو ادب کو دوست رکھتا ہو۔ اس لئے دوست واحباب اور مناسب ماحول کی وجہ سے دورانِ طالب علمی میں ہی وہ بطور ادیب اپنی شناخت قائم کر چکے تھے علی گڑھ یونیورسٹی میں قیام کے دوران بھی انھوں نے کچھ ایسے کارنمایاں انجام دیئے جو اپنی مثال آپ ہیں علی گڑھ نے ان کی شخصیت کو بالیدہ اور فکر کو تابناک بنایا۔ یہاں پہنچ کر ان کی تخلیقی صلاحیت نکھر گئی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سرسید ہال کے ''مجلہ'' ''اسکالر'' کا پیروڈی نمبر مرتب کیا جس میں خود ان کے دو مضامین ''کپور ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' اور طرز نگارش میری'' شامل تھے۔ دونوں مضامین کی ادبی حلقوں میں بہت پذیرائی کی گئی۔ بالخصوص ''کپور ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ ایک لا جواب تخلیق تھی۔ جس کی مثال آج تک کی تمام پیروڈیوں میں نہیں ملتی۔ تعلیم پوری کرنے بعد واپس پھر لکھنؤ چلے آئے اور با قاعدہ ادبی زندگی کی عملی شروعات کی۔ تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ دورانِ طالب علمی دوست واحباب کا جو حلقہ تھا وہ ادیب، شاعر اور صحافی کا حلقہ تھا۔ اسی رشتے اور رواسم کو اپنی عملی زندگی کی شروعات کرنے میں پاشا نے مدنظر رکھا۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران احمد جمال پاشا ترقی پسندوں کی ادبی نشستوں میں شریک ہوتے تھے۔ جو آلِ احمد سرور کے گھر پر حسب معمول اتوار کی شام کو ہوا کرتی تھی۔ وہیں احمد جمال پاشا کی ملاقات حیات اللہ انصاری سے ہوئی جو لکھنؤ میں ''قومی آواز'' میں کام کرتے تھے۔ جان پہچان بے تکلفی میں بدل گئی۔ ان کے بے تکلف مراسم کی وجہ سے اور کچھ با مزہ تبسم کی وجہ سے جو بھی ان کے قہقہے میں شامل ہوا وہ ہمیشہ کے لئے ان کا گرویدہ ہو گیا۔ پاشا جب علی گڑھ سے واپس آئے تو حیات اللہ انصاری اردو

اخبار ''قومی آواز'' کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ پاشا فکر معاش اور روزی روٹی کے چکّر میں صحافی بن بیٹھے۔ غالباً ۱۹۶۰ء کے زمانے میں پاشا نے اخبار ''قومی آواز'' لکھنؤ میں نوکری شروع کر دی۔ پھر ادبی سرگرمیوں میں شامل ہونے کے مواقع بھی فراہم ہوتے رہے اور لکھنے پڑھنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

احمد جمال پاشا نے جب ادبی دنیا میں قدم رکھا تو لوگ انگشت بدنداں ہو گئے۔ احمد جمال پاشا بغیر کسی گھن گرج کے اردو کے ادبی حلقے میں ہنستے ہنستے شامل ہو گئے۔ ان کی حیرت انگیز مقبولیت ان کی غیر معمولی شخصیت کی پیداوار ہے۔ انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے ہی میں کپور ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' جیسا کامیاب مضمون لکھ کر لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر ادب میں مارشل لاء اور ''رستم امتحان کے میدان میں'' لکھنے کے بعد ان کی ادبی حیثیت مسلّم ہو گئی۔ جس کو نظر انداز کرنا کسی بھی ماہرین فن کے لئے مشکل کام تھا۔ یوسف ناظم نے اپنے ایک مضمون میں اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''احمد جمال پاشا عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے لیکن انہوں نے بہت پہلے لکھنا شروع کر دیا اور ان کے لکھنا شروع کرتے ہی شہرت ان کے گھر دوڑی دوڑی چلی آئی تھی۔ ''نقوش کا طنز ومزاح نمبر ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا اس میں ان کا ایک مضمون موجود تھا۔ ''نقوش'' کے شخصیات نمبر میں بھی احمد جمال پاشا موجود ہیں جبکہ یہ ۱۹۵۸ء یا ۱۹۵۹ء میں چھپا تھا۔'' (۱۲)

احمد جمال پاشا کی نجی زندگی بھی طنز کا مجموعہ ہے ان کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی سے ازدواجی زندگی میں ناکامی ہوئی۔ شادی کے چند مہینے بعد ہی شریکِ حیات سے نہ نبھی اور طلاق ہو گئی۔ دوسری شادی بہار کے مردم خیز شہر سیوان میں ہوئی۔ ۱۱ر فروری ۱۹۶۶ء کو محترمہ سرور جمال سے نکاح ہوا۔ دس سال لکھنؤ اور سیوان کی آمد ورفت میں گزرا آخر میں لکھنؤ کی تمام سرگرمیوں سے قطع تعلق کیا اور اہلِ لکھنؤ کو وداعی سلام کر کے پاشا ۱۹۷۵ء میں اپنے سسرال سیوان چلے آئے اور یہاں بہار یونیورسٹی کے ذکیہ آفاق اسلامیہ کالج سیوان کے شعبۂ اردو میں لکچرر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ درس وتدریس کا جو سلسلہ شروع ہوا تو تا حیات چلتا رہا۔ احمد جمال پاشا نے جس تعلیمی سفر کی شروعات لکھنؤ کے اسلامیہ کالج سے کی تھی اسکا اختتام سیوان کے اسلامیہ کالج میں ہوا اور جو ادبی سلسلہ ۱۹۵۰ء میں شروع ہوا تھا۔ ۳۷ر سال کی مسافت طے کرنے کے بعد ۲۸ر ستمبر ۱۹۸۷ء کو عظیم

آباد میں ختم ہوا۔ احمد جمال پاشا کے آباء اجداد نے فکر معاش میں جو سفر عظیم آباد سے شروع کیا تھا۔ پاشا نے اس کا اختتام بھی عظیم آباد میں کیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آباء اجداد نے پورب سے پچھم اور پاشا نے پچھم سے پورب کی جانب سفر کیا۔ ساری عمر جس نے دنیا میں قہقہے بکھیرے، رونے والوں کو کبھی ہنسایا تو کبھی گدگدایا مگر قدرت نے اس مزاح نگار کے ساتھ ایسا مزاق کیا جو پاشا کی زندگی کا المیہ تھا یعنی اولاد سے محرومی۔ لاولدی کا احساس زندگی کے ہر ہر موڑ پر ہوتا ہے۔ اولاد سے محرومی کا غم انہیں بھی مرتے دم تک تھا مگر کبھی بھی لب پر نہ شکوہ آیا اور نہ مغموم دیکھے گئے بلکہ سارے جہاں کا درد دل میں دبائے قہقہ لگاتے رہے۔ پاشا کی اس تفصیلی سوانح سے ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ پاشا زندگی کے تمام نشیب فراز کا مقابلہ خنداں پیشانی سے کرتے رہے۔ دشوار سے دشوار مراحل کو بھی آسانی سے سر کیا ادبی ذوق وشوق میں کوئی کمی نہیں آئی تا عمر اردو کی خدمت میں لگے رہے۔ خواہ وہ تحریری شکل میں ہو یا تدریسی شکل میں پاشا بحیثیت ادیب پہلو دار شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے ۳۷ رسالہ ادبی سفر میں پاشا نے کم وبیش ایک درجن کتابیں شائع کرائیں۔ جن میں کچھ تو ان کی تخلیقی کوشش تھی اور کچھ انتخاب وترتیب۔ بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں پاشا کی تخلیقی صلاحیت اپنے شباب پر تھی کافی تعداد میں کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئیں۔ پاشا کے مضامین کا پہلا مجموعہ اندیشہ شہر'' ۱۹۶۳ء میں منظر عام پر آیا۔ اسکے علاوہ پانچ اور طنزیہ مزاحیہ مضامین وانشائیوں کے مجموعے منظر عام پر آئے جس کی تفصیل یہ ہے۔ ''ستم ایجاد'' ۱۹۶۶ء ''لذت آزار'' ۱۹۶۸ء ''مضامین پاشا'' ۱۹۷۴ء ''چشم حیراں'' ۱۹۷۸ء اور پتیوں پر چھڑکاؤ'' ۱۹۸۶ء پاشا نے یوں تو بہت سی تحریریں جدا جدا انداز میں چھوڑی ہیں لیکن پاشا کو ادبی دنیا میں طنز ومزاح نگار یا انشائیہ نگار کی حیثیت سے ہی جانا جاتا ہے۔ اس لئے درج بالا نصف درجن کتابیں ہی ان کی پہچان کا ذریعہ ہیں۔ ویسے اور دوسری کتابیں بھی قابلِ قدر ہیں۔ مثلاً ''غالب سے معذرت کے ساتھ'' اردو کے چار مزاحیہ شاعر'' ۱۹۶۵ء مجاز کے لطیفے'' اور ملا نصیر الدین کے لطیفے'' ۱۹۶۶ء میں ''ہجویات میر'' اور شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت ۱۹۶۷ء میں ''طلسمی کتا'' ۱۹۷۲ء میں بہادر ٹمبا'' ۱۹۷۳ء ''ظرافت اور تنقید'' ۱۹۸۲ء اور دنیا کی لوک کہانیاں'' ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئیں۔ ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ پاشا نے اس دار فانی سے کوچ کیا سب کچھ ادھورا رہ گیا۔ زیر طبع کتابیں درج ذیل ہیں۔ انشائے جمال۔ (دو حصوں پر مشتمل پہلا حصہ فن انشائیہ سے متعلق اور دوسرا انشائیوں کا انتخاب) ''چراگاہ'' انشائیوں اور مضامین کا مجموعہ۔ ''گلوریاں'' منک باؤذن (ترجمہ)۔ نامۂ اعمال (کلام سید محمد جعفری

کا انتخاب) مضامین اکبر۔ (اکبر کے مضامین کو ترتیب دیا) زیر طبع کتابوں کا ذکر خود پاشا نے اپنی دوسری کتابوں میں بھی کیا ہے۔ جس سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

زیر طبع کتابوں کے علاوہ کچھ مسودات بھی پاشا نے چھوڑے ہیں جس کی فہرست معلم اردو'' جنوری ۱۹۸۸ء میں ادارہ کی طرف سے شائع ہوئی۔ ملاحظہ ہو۔

''تذکرہ صوفیائے بہار'' (تقریباً مکمل) ظرافت شناسی (تقریباً دو حصہ مکمل) تذکرہ بہار بہار (تقریباً مکمل) تذکرہ صنم خانۂ تبسم (تقریباً ایک حصہ مکمل) تذکرہ ہزار داستان (دفتر ظرافت) تین حصہ مکمل، تذکرۂ صوفیائے سارن (تقریباً مکمل) تذکرۂ ظرافت سارن (تقریباً مکمل) خود نوشت سوانح جاری تھا۔ (۱۳)

درج بالا تمام تفصیلات سے احمد جمال پاشا کی ادبی حیثیت اور فنی شخصیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پھر بھی پاشا کی پہلو دار شخصیت کا جائزہ ہم بحیثیت ادیب الگ الگ طرز تحریر اور اصناف کے حوالے سے لیں تو ان کی پوری تصویر ابھر کر سامنے آئے گی۔ درج ذیل حیثیت سے پاشا کی شخصیت کا تجزیہ کرنا بہتر ہوگا۔ احمد جمال پاشا بحیثیت: (۱) انشائیہ نگار (۲) طنز ومزاح نگار (۳) تحریف نگار (۴) خاکہ نگار (۵) بچوں کے ادیب (۶) محقق ونقاد (۷) صحافی اور (۸) لطیفہ گو۔

(۱) احمد جمال پاشا بحیثیت انشائیہ نگار:

اس موضوع کے تحت تفصیل سے بحث اس کتاب کے چوتھے باب میں ہوگی اسلئے اس بحث کو یہاں نظر انداز کیا جا سکتا ہے تا کہ آئندہ باب میں اس کی معنویت موزوں ہو سکے۔

(۲) احمد جمال پاشا بحیثیت طنز ومزاح نگار:

اردو میں طنز ومزاح نگار کی حیثیت سے پطرس بخاری، شوکت تھانوی، اور کنہیا لال کپور کی حیثیت مسلّم ہے۔ طنز ومزاح کی روایت کو ان لوگوں نے جہاں چھوڑا تھا۔ احمد جمال پاشا نے اس کو آگے بڑھایا۔ مطالعہ وسیع ہونے کی وجہ سے ابتداء سے ہی ان کے مضامین میں اعتدال پسندی کی سی

کیفیت ہے اوران کے یہاں طنز ومزاح کا ایک اعلیٰ مذاق ملتا ہے۔ پاشا نے ادبی سفر کی شروعات ہی طنز ومزاح نگار کی حیثیت سے کی۔ ان کا سب سے پہلا مضمون ''من چغد بیابانم'' اور پھر اس کے بعد ''طرز نگارش میری'' ''رستم امتحان کے میدان میں'' ''ادب میں مارشل لاء'' اور غدر ۱۹۵۷ء کے اسباب وغیرہ کے علاوہ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین بھی ہیں ان کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین درج ذیل مجموعوں میں شامل ہے:

اندیشۂ شہر، ستم ایجاد، لذت آزار، مضامینِ پاشا، چشم حیراں، اور پتیوں پر چھڑکاؤ'' وغیرہ

احمد جمال پاشا کے یہاں ہر لفظ، جملے اور فقرے سے مزاح کی ایک لہر اٹھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ عبارت میں بے ساختگی، ندرت، سلاست اور شگفتگی پائی جاتی ہے بات سے بات پیدا کر کے وہ سماج کی بڑی سے بڑی ناہمواریوں پر سے نقاب اٹھا دیتے ہے۔ اپنے مطالعے مشاہدے اور تجربے کی مدد سے زندگی کے عدم توازن پر خود ہنستے اور دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر پہلو اور سماج کے ہر طبقے کی نفسیات اور طور طریقے سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں اور اسی لئے جب وہ کسی کردار یا طبقے کی ناہمواریوں کو طنز کا شکار بناتے ہے تو ان کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھتا ہے اور وہ اس میں ایسے ایسے نکتے پیدا کر دیتے ہیں کے پڑھنے والا بے ساختہ قہقہہ لگانے لگتا اور غور فکر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مثلاً ان کا مشہور مضمون ''ادب میں مارشل لاء'' جس میں انہوں نے موقع پرست، ناقدوں، ادیبوں، محققوں، اور شاعروں کی مطلب پرستی اور حماقتوں کا مذاق اڑایا ہے وہ ایسے ایسے بنیادی نکتوں کو مزاحیہ انداز میں بیان کر گئے ہیں جن سے آشنا تو سبھی ہوتے ہیں مگر انہیں قلم بند کرنے کی جرأت کم ہی لوگ کر پاتے ہیں۔ شاعری میں جہاں غلو ہوتا ہے وہیں شاعر میں خوش فہمی کا مادہ بھی پایا جاتا ہے ایک شاعر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ایک شاعر رسالہ کو غزل بھیجتا ہوا پکڑا گیا۔ اس پر الزام ہے کہ اُس نے خود اپنے ہاتھوں سے علامہ اور ایشیا کا عظیم ترین شاعر'' وغیرہ لکھا تھا۔ اس پر دوسروں سے بھی جبراً اپنے آپ کو عظیم شاعر کہلوانے اور خلاف مرضی تعریفیں اور اداریئے لکھوانے کے جرم میں مقدمہ قائم کر دیا گیا ہے ایک اور شاعر جو کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اپنے اسٹینو سے خود اپنی ہی شان میں تنقیدی مقالہ لکھواتے ہوئے بروقت پکڑ لئے گئے۔ (۱۴)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ احمد جمال پاشا ادیبوں اور شاعروں کے طبقے

کی نفسیات کے کیسے نبض شناس تھے۔ یہ موجودہ مسائل کی تشریح وتعبیر کو مزاحیہ انداز میں پیش کرتے ہیں ان کی نظر علمی اور معاشرتی مسائل پر زیادہ رہتی ہے علمی مسائل پر ان کے چند طنزیہ اور مزاحیہ حد درجہ مقبول ہیں مثلاً رستم امتحان کے میدان میں'' ہم نے ریسرچ کی'' جدید تنقید نویسی'' ادب میں بینک بیلنس'' ادب میں بانس کی اہمیت'' امتحان میں نقل کا فن اور ادیبوں کی قسمیں'' وغیرہ میں دورِ حاضر کے ادب اور نظامِ تعلیم یا درس وتدریس میں عملی طور پر جو کچھ رائج ہے اس پر طنز کے تیر برسائے ہیں اور مزاحیہ انداز میں اس مسئلے کو پیش کر کے لوگوں کی توجہ مرکوز کرائی ہے تاکہ معاشرے میں پھیلی ہوئی علمی بدعنوانیوں کو لوگ دور کر سکیں۔ دوسری طرف انھوں نے علمی کے علاوہ معاشرتی مسائل پر بھی اچھا طنز کیا ہے معاشرے میں عملی طور پر پیش آنے والی دشواریوں کا طنزیہ انداز میں احساس دلایا ہے۔ مثلاً ''شکر کا چکر'' مکان کی تلاش'' مسند گدی کرسی اور بوری'' سڑک کا گھیراؤ'' سڑک کے گڈھوں سے انٹرویو'' اور نوکر کا چکر، وغیرہ کے حوالے سے انھوں نے سماجی ناہمواریوں، دشواریوں اور پریشانیوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے الفاظ کی تراش خراش سے مزاحیہ پہلو پیدا کیا ہے۔ احمد جمال پاشا مزاح پیدا کرنے کے لئے ایک طریقہ نہیں بلکہ وہ موقع ومحل کی مناسبت سے نت نئے حربے کا استعمال کرتے، کہیں رعایت لفظی سے کام لیتے تو کہیں الفاظ کے الٹ پھیر سے، کہیں کردار کے قول وفعل اور عمل سے تضاد پیدا کرتے اور مزاحیہ پہلو اجاگر کرتے تو کہیں سماج میں پھیلی ناہمواریوں اور بدعنوانیوں کو اپنے طنز کا ہدف بناتے ہیں مگر خاص بات یہ ہے کہ ان کا مقصد صرف ہنسنا ہنسانا نہیں بلکہ ان کے مضامین میں پس پردہ ایک گہری مقصدیت کی کارفرمائی بھی ہوتی ہے یہ مقصدیت ہی ان کے فن کو گہرائی وگیرائی عطا کرتی ہے۔

(۳) بحیثیت پیروڈی یا تحریف نگار:

اردو میں پیروڈی یا تحریف نگاری کی شروعات شاعری میں ہوئی نثر میں پیروڈی کا چلن عام نہ ہو سکا۔ ''اودھ پنچ'' کے زمانے میں پیروڈی کو فروغ ملا مگر شاعری ہی پر زیادہ دھیان دیا گیا۔ نثر میں تھوڑی بہت تحریریں پیروڈی کی شکل میں ملتی ہیں احمد جمال پاشا نے نثر میں پیروڈی کو شعوری طور پر برتا اور ارادتاً اسکی تحریک چلائی۔ نثری پیروڈی میں ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔ احمد جمال پاشا نے قیام علی گڑھ کے دوران سرسید ہال کے مجلہ ''اسکالر'' کا پیروڈی نمبر ترتیب دیا۔ جب وہ ایم۔ اے کے طالب علم تھے۔ اس مجلّے میں خود ان کی دو پیروڈی شامل ہیں۔ ''طرز نگارش میری'' اور'' کپور

ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' آخر الذکر پیروڈی ہی سے پاشا کو شہرت ملی۔ کپور ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' میں پاشا نے بہت ہی عمدہ انداز میں اردو کے چند مشہور ادیب ونقاد کے طرز نگارش اور اسلوب کی تحریری نقل پیش کی ہے۔ جس کو پڑھکر اس ادیب ونقاد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ کہیں سے بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ پڑھنے کے بعد یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ اصل تحریر ہے یا پیروڈی۔ ملاحظہ ہو ایک اقتباس۔ جس میں انھوں نے کلیم الدین احمد کے اسلوب کی نقل کر کے پیروڈی کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے لکھتے ہیں:

> ''اردو میں طنز کا وجود محض فرضی ہے یہ صفر کا نقطۂ خیال ہے یا زیبرے کی موہوم کمر...... تفصیل کی یہاں نہ گنجائش ہے نہ ضرورت، نہ وقت، غالبًا یہ پطرس کو دیکھ کر میدان میں آئے مگر افسوس کہ ان میں پطرس کے محدود اوصاف کا بھی مطلق پتہ نہیں..... کیونکہ ان کے خیالات ماخوذ واقفیت محدود، نظر سطحی، تخئیل ادبی، علمیت غائب شخصیت اوسط، املا غلط، انشاء غلط، برخود غلط پھر کورانہ تقلید میں مثلِ آفتاب روشن''(۱۵)

متذکرہ بالا اقتباس میں کلیم الدین احمد کے تحریر کی جو نقل کی گئی ہے وہ اصل سے کہیں بھی کم نہیں ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر رشید احمد صدیقی، عبادت بریلوی قاضی عبد الودود اور احتشام حسین کے طرز کی عمدہ پیروڈی پیش کی ہے۔ جس کو پڑھنے کے بعد قاری عش عش کرنے لگتا ہے۔ صرف اسی ایک پیروڈی سے احمد جمال پاشا کی شخصیت پیروڈی نگار کی حیثیت سے مکمل ہو گئی۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جمال پاشا کے فکر وشعور میں تحریف نگاری کے جراثیم موجود تھے۔ جو وقتاً فوقتاً اپنا اثر دکھاتے تھے جسکے سبب چند اور مشہور پیروڈی کا عمل وجود میں آیا۔ پاشا نے چند حسینوں کے خطوط کے نام سے ایک کتاب شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا جو پورا نہ ہو سکا لیکن خطوط کی شکل میں انھوں نے چند ایسی پیروڈیاں لکھی جس کا جواب ممکن نہیں مثلاً ''گدھے کا خط کرشن چندر کے نام'' کتے کا خط پطرس کے نام'' پڑھے لکھوں کے خطوط محمد فاضل کے نام'' اور گلیسر بوائے کا خط'' وغیرہ پیروڈی کی عمدہ مثالیں ہیں۔

خطوط نگاری کے علاوہ بھی'' آموختہ خوانی میری'' خود نوشت سوانح نگاری اور سوانح نگاروں پر ایک کاری ضرب ہے مگر جہاں یہ طنزیہ ہے وہیں یہ خود نوشت تحریر کرنے کے انداز کی پیروڈی بھی ہے جس میں خود نوشت کے تمام نکتوں کو بہ خوبی بیان کیا گیا اور پیروڈی کی شکل میں یہ قابل تعریف

ہے۔ پیروڈی لکھنے کے علاوہ پیروڈی سے متعلق مضامین اور دوسری کتابوں کو بھی پاشا نے مرتب کیا۔ مثلاً'' غالب سے معذرت کے ساتھ'' جس میں غالب پر لکھی گئی پیروڈیاں ہیں جو اودھ پنچ میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ''اودھ پنچ'' اخبار جو طنز وظرافت میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے پاشا نے اس کے تیسرے دور کا آغاز کیا اور اپنی انتھک کوشش سے اسکو نکالتے رہے مگر صرف دو سال کے بعد ہی یہ بند ہو گیا اس میں ان کی تحریف نگاری کو فروغ ملا۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ احمد جمال پاشا ایک کامیاب پیروڈی نگار تھے جنھوں نثر میں سب سے زیادہ پیروڈیاں لکھی ہیں۔

(۴) بحیثیت خاکہ نگار:

لفظوں کے الٹ پھیر اور جملوں کی تراش وخراش یا اسے اگر دوسرے لفظوں میں کہیں تو الفاظ کے ایسے گورکھ دھندے جس کو پڑھنے کے دوران ہی قاری کے ذہن میں کسی شخصیت کا جو عکس ابھرتا ہے اسے ہم خاکہ کہہ سکتے ہیں معمار ہونا، مصور ہونا، بت تراش ہونا اتنا مشکل فن نہیں جتنا خاکہ نگار ہونا۔ خاکہ نگار کے پاس صرف الفاظ ہوتے ہیں جس کی بنیاد پر وہ کسی کا عکس ابھارنے کی کوشش کرتا ہے جب کہ بت تراش، مصور یا معمار کے پاس دوسری کئی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی شمولیت سے وہ کسی کی شخصیت میں حسب ضرورت رنگ وروغن بھر سکتا ہے کسی کا خاکہ لکھنے کے لئے خاکہ نگار کو بھی زندگی کی ان ناہمواریوں کو محسوس کرنا ہوتا ہے۔ جس سے وہ شخص گزر چکا ہے اس کے تمام نکتوں سے خاکہ نگار کو واقف ہونا چاہیے۔ خاکہ نگار کو باریک بین، تجربات ومشاہدات اور زبان وبیان پر مہارت حاصل ہونا چاہیے اور ان سب کی مدد سے کسی شخصیت کے آداب واطوار، رہن سہن، چال ڈھال اور عادات وخصائل کے ذریعہ اس کی قلمی تصویر کشی کرتا ہے۔ خاکہ نگاری میں کسی طرح کی ملاوٹ کو کھوٹ سمجھا جاتا ہے اس سے شخصیت مجروح ہوتی ہے۔ کسی بھی شخصیت کے ظاہر وباطن کو ادبی سانچے میں ڈھال کر حقیقی شکل سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ خاکہ کو ہم قلمی شبیہ کہہ سکتے ہیں جس میں عکس ابھرتا ہے شکل نہیں ہوتی بلکہ عکس سے ذہنی دریچہ میں جو تصویر بنتی ہے وہ خاکہ ہوتا ہے۔ خاکہ نگار کو کسی بھی شخصیت پر قلم فرسائی کرنے سے قبل اس شخصیت کے ردیف وقافیے سے واقف ہونا ضروری ہے اس کے نشیب وفراز سے آشنائی لازمی ہے ورنہ حقیقی عکس ممکن نہیں۔

اردو میں چند نام خاکہ نگاری کے ضمن میں آتے ہیں اس میں شوکت تھانوی کے بعد سب

سے اہم نام احمد جمال پاشا کا ہے۔ شوکت تھانوی کے خاکوں کا مجموعہ ''شیش محل'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا جس میں ایک سو سے زیادہ افراد کی قلمی شبیہ کو پہلی بار کتابی شکل میں ترتیب دے کر اسے منظرِ عام پر پیش کیا گیا۔ شیش محل ''اردو خاکہ نگاری کا نقش اول ہے۔ جہاں سے اردو خاکہ نگاری کا باضابطہ آغاز ہوتا ہے یوں تو اردو میں مختلف افراد نے کئی حضرات کے خاکہ لکھے ہیں مگر ان کی تعداد معدود چند ہے۔ مثلاً عصمت چغتائی کا'' دوزخی'' اس کے علاوہ رشید احمد صدیقی، مولوی عبدالحق، سعادت حسن منٹو، خواجہ حسن نظامی، کنہیالال کپور، فکر تونسوی، ڈاکٹر نذر امام، مجتبیٰ حسین، محمد طفیل، عابد حسین اور ڈاکٹر یوسف ناظم نے گاہے بہ گاہے خاکہ نگاری کے گلستاں میں کچھ گل بوٹے کھلائے ہیں لیکن احمد جمال پاشا نے ''شیش محل'' کی روایت کو آگے بڑھانے کی شعوری کوشش کی اور باضابطہ خاکہ نگاری کے اس پودے کو تناور درخت بنا دیا۔ ''آئینے'' کے نام سے احمد جمال پاشا نے اپنے خاکوں کو مرتب کرنا شروع کیا تھا مگر اچانک زندگی سے خفا ہو جانے کے سبب ان کا یہ خواب تشنۂ تعبیر رہ گیا۔

''آئینے'' میں پچپن خاکے ہیں جو گاہے بہ گاہے ہندوستان و پاکستان کے ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں جن کی تصدیق ڈاکٹر ظفر کمالی نے اپنے مضمون میں کی ہے

> ''احمد جمال پاشا نے ''شیش محل'' کی تقلید میں ''آئینے'' کے عنوان سے مختصر خاکوں کا ایک مجموعہ مرتب کرنا شروع کیا تھا جو کتابی صورت میں منظرِ عام پر نہ آسکا۔ البتہ اس کی کچھ قسطیں مختلف اخبارات و رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئی تھیں اس مجموعہ میں پچپن خاکے شامل ہیں۔'' (۱۶)

درج بالا اقتباس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ احمد جمال پاشا نے ''آئینے'' کو ''شیش محل'' کی تقلید میں مرتب کرنا شروع کیا تھا جس میں دوست واحباب کے علاوہ اساتذہ وغیرہ پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ ان کے تمام خاکے خواہ وہ طویل ہوں یا مختصر اپنے فن کے اعتبار سے مکمل معلوم ہوتے ہیں جن کو پڑھ کر شخصیت سے آشنائی بھی ہوتی ہے اور ذہن اس کی پیکر تراشی بھی کر لیتا ہے۔ احمد جمال پاشا اپنی منفرد طرزِ تحریر کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ادبی دنیا میں برساتی بادل کی طرح سارے آسمان ادب پر چھا گئے اور تا حیات موسلا دھار برستے رہے۔ بارش کی رفتار کبھی تیز اور کبھی مدھم ہوتی رہی مگر یہ سلسلہ لا متناہی چلتا رہا جس سے اردو ادب کو طرح طرح کے نایاب گوہر ملے۔ چست و چوبند جملے اور لفظوں کی خوبصورت ترتیب سے وہ زیر لب مسکرانے والی بات پیدا کر دیتے

تھے ان کے خاکوں میں اکثر و بیشتر ظرافت اور مزاحیہ جملے ملتے ہیں۔ جس سے شخصیت کے منفی و مثبت پہلوؤں کی عکاسی ہوتی ہے۔ ''آئینے'' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے سید حسن عباس گوپال پوری یوں رقمطراز ہیں:

> ''احمد جمال پاشا نے اپنے مختصر خاکوں میں ایک خاص عہد اور خاص نوعیت کے لوگوں کی چلتی پھرتی تصویریں پیش کی ہیں ان کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ مختصر ہوتے ہوئے بھی کسی طرح کی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا ہر خاکہ اپنے آپ میں مکمل ہے۔ ساتھ ہی شخصیت کی نقاب کشائی بڑے حسین اور دلفریب انداز میں کی گئی ہے۔ اسلوب بیان مختلف و منفرد آہنگ کا حامل ہے ایک خاص قسم کی مترنم لے اور شگفتہ بیانی نے ان کے خاکوں کو ابدیت کا لباس عطا کر دیا ہے'' (۱۷)

احمد جمال پاشا نے خاکہ لکھ کر ہندوستان و پاکستان کی ممتاز ادبی ہستیوں سے قاری کو متعارف کرایا ہے جنہیں پاشا نے قریب سے دیکھا ہے اور پرکھا ہے۔ پھر اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں پوری ادبی دیانت داری اور خلوص کے ساتھ انکا خاکہ تحریر فرمایا ہے۔ خاکہ نگاری کے فرائض کو بہت ہی اچھے ڈھنگ سے نبھایا اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر کے دکھایا ہے۔ انہوں نے جن کے خاکے لکھے ان میں کچھ کے اسمائے گرامی ہیں۔ حیات اللہ انصاری، پطرس، آل احمد سرور، احتشام حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم، خواجہ احمد عباس، محمد حسین قدوائی، ستیش بترا، اقبال مجید، رتن سنگھ اور سید مسیح الدین رضوی وغیرہ۔

خاکہ نگاری کی حیثیت سے احمد جمال پاشا کا شمار خاکہ نگاری کے صفِ اوّل میں ہوتا ہے۔ چند نام اگر گنوائے جائیں تو ان کے نام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ انہوں نے باضابطہ اس صنف کی زلفِ پریشاں کو سنوارا سجایا حسن و دلکشی عطا کی ہے۔ جس سے خاکہ نگاری کی روایت آج تک قائم ہے۔ یہ درمیانی خاکہ نگاروں میں ایک کڑی کا کام کرتے ہیں۔

(۵) بحیثیت بچوں کے ادیب:

احمد جمال پاشا نے یوں تو بہت کچھ لکھا ہے جو بڑوں کے لئے مخصوص ہے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے بچوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا بلکہ بچوں کیلئے بھی مستعدی سے مسلسل لکھتے رہے۔ وہ ابتدائی

دور سے ہی بچوں کے لئے نت نئے تحفے پیش کرتے رہے۔ زبان و بیان میں سادگی اور سلاست انکا خاصہ تھا مگر جب وہ بچوں کی طرف رجوع کرتے تو انداز بیان بالکل منفرد ہوتا۔ لفظوں کا انتخاب، تسلسل روانی، آسان فہم الفاظ اور بچوں کی ذہنی استطاعت کا خاص خیال رکھتے اور نصیحت آموز موضوع کا انتخاب کرتے ہیں جس سے ایسی گدگدی پیدا کرتے کہ پڑھنے والا ہنسنے اور قہقہے لگانے پر مجبور ہوجاتا۔ بچوں کی نفسیات کا علم انہیں تھا۔ اس لئے جب بھی وہ بچوں کیلئے لکھتے۔ ان کی نفسیات اور محدود علم یا دائرہ کا خاص خیال رکھتے۔ دسمبر ۱۹۵۴ء کے ''بچوں کا آجکل'' (آجکل اردو کے ضمیمہ کے طور پر شائع ہوتا تھا) میں ایک بچوں کی کہانی ''چچا چھمن'' لکھی جس میں تکرار سے ایسی دلچسپی پیدا کی ہے کہ پڑھنے والا ایک ہی بیٹھک میں پوری کہانی ختم کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ ملاحظہ ہو ایک اقتباس:

> ''ایک روز چہار شنبہ کو چار بج کر چون منٹ چوالیس سکنڈ پر چچا چھمن چور بازار سے چرایا ہوا چار خانے کا چوغا اور چار آنے والی ٹوپی اور چار ہی آنے والا چرودھا پہنے چورنگی کے چوراہے پر چوکی والے چائے خانے میں چائے پینے گئے اور چائے چھوکرے سے چار پیسے والی چائے اور چار مینار سگریٹ منگوایا۔ چائے آئی مگر چمچہ ندارد۔ چچا نے چیخ کر چھوکرے سے کہا۔ او میاں چھٹن! چائے لائے اور چمچہ چھوڑ آئے چینی چلائیں تو کیسے۔'' (۱۸)

کہانی کے صرف ایک اقتباس کو پڑھ کر ہی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کہانی میں انداز تحریر کیسا ہے۔ ساری کی ساری کہانی ایک دوسرے میں موتی کے ہار کی طرح پروئی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ تسلسل اور روانی اس کہانی کی بہترین خوبی ہے۔ اس کے علاوہ وہ بچوں کے لئے مضمون بھی لکھتے۔ مضمون ایسا کہ جس سے بچوں کے علم میں کچھ اضافہ ہو مثلاً ''دنیا کا پہلا اخبار'' ان کا ایک مضمون ہے جو اکتوبر ۱۹۵۶ء کے بچوں کے آجکل میں شائع ہوا۔ لیٹ لطیف''، طلسمی کتا'' اور ''بہادر تمبا'' بھی انھوں نے بچوں کیلئے لکھا۔ اردو کے علاوہ ہندی میں بھی ''بالشتیے کی گھنٹی'' لکھا جو گیان بھارتی پاکٹ بکس (اتر پردیش) سے شائع ہوئی۔

احمد جمال پاشانے ادبی زندگی کے آخری دور میں تحقیق وتنقید پر زیادہ زور دیا مگر ساتھ ہی ساتھ بچوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ دنیا کی لوک کہانیاں، بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔ اچانک انتقال کی وجہ سے ان کی بیشتر تصنیفات زیر طبع یا مسودات کی شکل میں ادھوری رہ

گئی۔ اس لئے ایسی بہت سی تخلیقات جو بچوں تک پہنچانا چاہتے تھے وہ نہ پہنچ سکیں۔

(۲) بحیثیت محقق و نقاد:

بچپن سے ہی مزاحیہ مزاج ہونے کے باوجود احمد جمال پاشا نے کبھی کبھی سنجیدہ ادب کی طرف بھی رجوع کیا۔ تحقیق وتنقید میں ہر انسان کا گزر ممکن نہیں اس میں عرق ریزی اور باریک بینی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ادب کی دشوار گزار راہ ہے اس میں ذرا بھی نظر نے دھوکا کھایا تو خدا سے جدا والی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ احمد جمال پاشا نے بہت سے تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھے جو ہندو پاک کے مختلف رسالوں میں بسا اوقات منظر عام پر آتے رہے۔ فن لطیفہ گوئی پر ان کا ایک مضمون ہے جس میں انہوں نے لطیفہ کے فن پر ایک سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ لطیفہ گوئی باضابطہ صنف نہیں مگر طنز ومزاح اور ظرافت کے میدان کے مرد مجاہد ہونے کی وجہ سے لطیفہ پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ یہ ان کی ایک تحقیقی کوشش ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تحقیقی صلاحیت کا اظہار ادبی زندگی کے ابتدائی اوقات میں کم اور آخری دور میں ایک جنون کی صورت اختیار کرچکی تھی جس کا ذکر گزشتہ صفحات پر ہو چکا ہے۔ زیر طبع کتابیں اور مسودات اس بات کی شہادت ہیں کہ آخری عرصے میں انہوں نے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین میں کم اور تحقیق وتنقید کے کام میں زیادہ دلچسپی لی۔ تمام مسودات کے تفصیل کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔ صرف سرسری طور پر اس کا ذکر ہی کافی ہے۔ طنز ومزاح ان کا مخصوص موضوع تھا اسلئے جہاں وہ طنزیہ ومزاحیہ مضامین لکھتے تھے وہیں طنز ومزاح کے فن سے بھی بحث کرتے تھے۔ طنز ومزاح کے فن پر انھوں نے کئی مضامین لکھے جس میں اس کے ارتقاء فن اور امکانات سے بحث کی ہے فنی خصوصیتوں کا بیان بھی کیا ہے اور طنز ومزاح کی سمت کا بھی تعین کیا ہے۔ ''اودھ پنچ'' میں انھوں نے طنز ومزاح پر کئی مضامین بہ نام دیگر بھی لکھے۔ کالم بھی لکھتے اور تنقید بھی ان کا ایک اہم مضمون ''آزادی کے بعد اردو میں طنز ومزاح'' آجکل اگست ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ جس میں آزادی کے بعد کے طنز ومزاح کی تفصیل بیان کی۔ آزادی سے قبل کے طنز ومزاح پر ''ترقی پسند تحریک اور اردو طنز ومزاح'' ایک مضمون ''ترقی پسند تحریک کا پچاس سالہ سفر'' نامی کتاب میں موجود ہے۔ طنز ومزاح سے متعلق متعدد مضامین کو انہوں نے قلم بند کیا۔ ظرافت اور تنقید'' ان کی ایک انفرادی تخلیق ہے۔ جس میں انہوں نے طنز ومزاح نگار اور اس سے متعلق اخبارات ورسائل پر لکھے گئے مضامین کے انتخاب کے طور پر شائع کرایا جو ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ طنز وظرافت کی پہلی خالص تنقیدی کتاب ہے۔ طنز

ومزاح کے علاوہ فن انشائیہ پر بھی سیر حاصل تفصیل اکٹھا کر کے "انشائیہ کی اصطلاح" کے موضوع پر مضامین کی شکل میں دو قسطوں میں شائع کرایا جو "کتاب نما" دہلی کے شمارہ اکتوبر و نومبر ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔

"انشائے جمال" جو احمد جمال پاشا کے انشائیوں کا مجموعہ اور انشائیہ کے فن پر بحث سے متعلق مسودہ ہے جو اچانک ان کے انتقال کے سبب زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکا مگر اس کے بیشتر مضامین انشائیے اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ درج بالا تفصیل سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ جہاں احمد جمال پاشا طنز ومزاح نگار وانشائیہ نگار تھے وہیں محقق ونقاد بھی تھے۔

(۷) بحیثیت صحافی:

احمد جمال پاشا نے ادبی زندگی کی شروعات مزاحیہ مضامین لکھ کر کی مگر عملی زندگی میں فکرِ معاش نے انہیں تمام مصروفیتوں کے باوجود صحافی بنا دیا۔ علی گڑھ میں حیات اللہ انصاری سے ایک ملاقات ہوئی اور اس ایک ملاقات کی قربت نے دونوں کو یکجا کر دیا۔ تقریباً ۱۹۶۰ء میں لکھنؤ کے روز نامہ "قومی آواز" کے دفتر میں احمد جمال پاشا نے نوکری کر لی۔ پہلے کچھ دنوں تک ترجمہ پھر کالم نگار بھی رہے بعد میں نائب مدیر کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا۔ حالات نے ترک صحافت پر مجبور کیا اور ۱۹۷۵ء میں صحافی سے استاد بن کر سیوان منتقل ہو گئے۔ تقریباً پندرہ ۱۵ رسال روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ میں ملازمت کرنے کے درمیان ہی انہوں نے "اودھ پنچ" کی روایت کو پھر سے زندہ کیا۔ اس کے قبل لکھنؤ سے دوبار "اودھ پنچ" نکل کر بند ہو چکا تھا "اودھ پنچ" کو تیسری بار نکالنے کا سہرا پاشا کے سر ہے۔

اودھ پنچ کے تیسرے دور میں احمد جمال پاشا خود مدیر تھے اور بڑی مستعدی سے انہوں نے "اودھ پنچ" میں پھر سے ایک نئی جان ڈال دی۔ علی عباس حسینی کی صدارت میں ستمبر ۱۹۵۹ء میں ایک جلسہ ہوا جس میں اودھ پنچ کے تیسرے دور کی شروعات پروفیسر احتشام حسین کے ہاتھوں ہوئی۔ پہلا شمارہ ستمبر ۱۹۵۹ء کو منظرِ عام پر آیا کُل تیرہ شمارے نکلے آخری شمارہ ستمبر ۱۹۶۱ء کو منظرِ عام پر آیا اور مالی تنگ دستی نے احمد جمال پاشا جیسے قلم کے سپاہی کو بھی اودھ پنچ بند کرنے پر مجبور کر دیا۔ آخری دو شمارے کنہیالال کپور نمبر نکلے۔ اودھ پنچ کے بند ہو جانے کے بعد احمد جمال پاشا نے ناشر و پبلشر کی حیثیت سے پنچ پبلشر کو قائم رکھا اور وہیں سروری منزل کچا احاطہ کے پتہ پر کتابوں کی اشاعت کا کام

کرتے رہے کچھ اپنی اور رام لال و دیگر حضرات کی کتابوں کو زیورِ طبع سے آراستہ کیا مگر یہ کام ایک تخلیق کار کو زیب نہیں دیتا تھا نہ دلچسپی تھی اسلئے بند کر دیا۔

(۸) بحیثیت لطیفہ گو:

احمد جمال پاشا کے مزاج میں ہنسنا ہنسانا ہی زندگی ہے "بس چکا تھا طنز ومزاح میں پوری طرح غرق ہونے کے باوجود بھی پاشا بچوں کے ادیب بنے رہے' نقاد و محقق کے فرائض انجام دیتے رہے۔ لکچرار بن کر درس وتدریس سے جڑے رہے۔ روزی روٹی کیلئے صحافی بن گئے۔ ان تمام شعبوں میں رچ بس جانے کے بعد بھی پاشا کی طبیعت میں سنجیدگی نہ پیدا ہو سکی اور وہ ان تمام حیثیتوں کے حامل ہوتے ہوئے لطیفہ گو بھی بن بیٹھے۔ لطیفہ گو ہونے کے لئے انہوں نے صرف سنے سنائے لطائف کو نہیں سنایا بلکہ فنِ لطیفہ گوئی کی حیثیت متعین کی۔ فن لطیفہ گوئی کے بعد چنندہ لوگوں کے لطیفوں کا انتخاب جمع کیا اور سیر حاصل مقدمہ کے بعد اسے زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔ ادبی لطیفوں کے سلسلے میں ان کی بہت سی خدمات کا پتہ چلتا ہے۔ مگر دستیابی کا مسئلہ آج ان کی تخلیق کیلئے ایک اہم مسئلہ ہے۔ ان کی تصنیفات میں "ملا نصیر الدین کے لطیفے" "مجاز کے لطیفے" اور مزاح نگاروں کے لطیفے وغیرہ اہم ہیں۔ بعض ناقدین نے ان کے اس شوق کو ان کی خامی بتائی اور یہ اشارہ کیا کہ ایک صاحب طرز ادیب کے لئے یہ فال نیک نہیں پھر بھی پاشا نے ان کی باتوں کی پرواہ کئے بغیر عمدہ لطائف کو اکٹھا کیا اور کتابی شکل میں پیش کر دیا۔ اس سے پاشا کی تخلیقی صلاحیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ انھوں نے یہ بتایا کہ لطیفہ کیسے کہیں گے۔

> "لطیفے کا حسن اس کے اختصار میں ہے ادھر مقرر کے منہ سے پھول جھڑنا شروع ہوں ادھر محفل میں قہقہوں کے جگنو چمکنے لگیں۔ اسلئے اس کو اجمال مزاحیہ بھی کہا جاسکتا ہے...... اگر لطیفہ بحرِ طویل میں چلا گیا تو وہ حکایت، قصہ، افسانہ غرض کچھ بھی ہوسکتا ہے مگر لطیفے کے ذیل میں ہرگز شمار نہ ہوگا۔" (۱۹)

ان تمام ادبی حیثیتوں اور سوانحی تفصیل کے بعد صرف احمد جمال پاشا کی تقریر سے ایک اقتباس پیش کر کے ان کی پہلو دار شخصیت کے راز سے آشنا کرانا چاہونگا۔ جن سے ان کو تحریک ملی۔ ملاحظہ ہو:

> "جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا تو شوکت تھانوی' رشید احمد صدیقی'

کنہیالال کپور وغیرہ کے ڈنکے بج رہے تھے یہ بھی مختلف مکاتیب سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے شوکت تھانوی کی ڈھائی تین سو کتابیں پڑھی ہیں......شوکت تھانوی کے یہاں جیسی پیروڈی اور اچھے مزاحیہ ڈرامے ہیں ویسے کم ہی لوگوں نے لکھے ہونگے جب میں نے لکھنا شروع کیا تو یہی لوگ ادب پر چھائے ہوئے تھے۔"(۲۰)

درج بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پاشا کا مطالعہ وسیع تھا وہ اساتذہ کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ شوکت تھانوی سے اثر قبول کیا اور استفادہ کرنے کے بعد طنز ومزاح پیروڈی خاکہ اور انشائیہ نگاری کے میدان میں رنگ برنگے گل بوٹے کھلائے۔ اسلئے مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ احمد جمال پاشا کے طرز تحریر میں رشید احمد صدیقی اور شوکت تھانوی کی رنگارنگی ہے جس نے انہیں صاحب طرز نثر نگار بنایا بعد میں ان کی ادبی حیثیت میں بے شمار اضافے ہوئے جس میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے حسن بیان کے ساتھ ہی ساتھ ان کا وسیع مطالعہ اور مسلسل لکھنے کی لگن معاون ومددگار ثابت ہوئی انہیں کم وقت میں زیادہ شہرت ملی اور آج بھی احمد جمال پاشا کا نام غیر افسانوی ادب کے آسمان پر ستارے کی طرح درخشاں ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی

۱۔	معلم اردو، لکھنؤ جنوری ۱۹۸۸ء	۱۰۱
۲۔	معلم اردو، لکھنؤ جنوری ۱۹۸۸ء	۱۰۲
۳۔	معلم اردو، لکھنؤ جنوری ۱۹۸۸ء	۱۰۴
۴۔	کتاب نما، نئی دلّی، جنوری ۱۹۸۹ء	۸۱
۵۔	کتاب نما، نئی دلّی، جنوری ۱۹۸۹ء	۸۱
۶۔	نیا دور، لکھنؤ، یادِ رفتگاں نمبر حصہ اول، مارچ تا ستمبر ۱۹۸۸ء	۲۰۱
۷۔	چتیوں پر چھڑکاؤ، احمد جمال پاشا، پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، سیوان ۱۹۸۶ء	۱۳۴
۸۔	چتیوں پر چھڑکاؤ، احمد جمال پاشا، پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، سیوان ۱۹۸۶ء	۱۳۷
۹۔	کتاب نما، نئی دلّی جنوری ۱۹۸۹ء	۷۲
۱۰۔	کتاب نما، نئی دلّی جنوری ۱۹۸۹ء	۵۷
۱۱۔	کتاب نما، نئی دلّی جنوری ۱۹۸۹ء	۸۲
۱۲۔	کتاب نما، نئی دلّی جنوری ۱۹۸۹ء	۶۷
۱۳۔	معلم اردو، لکھنؤ، جنوری ۱۹۸۸ء	۱۳۹
۱۴۔	مضامین پاشا۔ احمد جمال پاشا، مکتبۂ دین وادب، لکھنؤ ۱۹۷۴ء	۸۰
۱۵۔	مضامین پاشا۔ احمد جمال پاشا، مکتبۂ دین وادب، لکھنؤ ۱۹۷۴ء	۱۰۵
۱۶۔	معلم اردو لکھنؤ، اگست ۱۹۹۰ء	۱۲

۱۷۔ نیادور، لکھنؤ، یادرفتگاں نمبر حصہ اول مارچ تا ستمبر ۱۹۸۸ء ۲۱۲

۱۸۔ آجکل، نئی دلّی، ستمبر ۱۹۵۴ء ۵۴

۱۹۔ ظرافت اور تنقید۔ احمد جمال پاشا، پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سیوان ۱۹۸۲ء ۱

۲۰۔ نیادور، لکھنؤ، یادرفتگاں نمبر حصہ اول، مارچ تا ستمبر ۱۹۸۸ء ۲۱۴

تیسرا باب

معاصرین احمد جمال پاشا

معاصرین احمد جمال پاشا

کسی فن یا فنکار کے پس منظر میں اسکی ذات اور تخلیقات میں جو چیز مشترک حیثیت رکھتی ہے وہ ہے اس کا ماحول۔ ماحول کے ردِ عمل کے طور پر فنکار اپنے گرد و پیش کے تجربات و مشاہدات کو اپنی تخلیقی بصیرت کے ذریعہ لفظوں کا جامہ پہنا کر قاری تک پہنچا دیتا ہے۔ دوسری طرف کسی بھی فنکار کے تجربات و مشاہدات میں اسکا ادبی ماحول اور معاصرین کے تعلقات بھی اس کی تخلیقات میں منعکس ہوتے ہیں۔ اس لئے فنکار کی تخلیقات پر کوئی بھی بحث تب مکمل نہ ہوگی جب تک اس کے معاصرین کے آئینے میں اسکی تصویر نہ دیکھی جائے۔ احمد جمال پاشا کی تخلیقات کے پس منظر میں جو عوامل کارفرما ہے ان کے حوالے سے ان کے عہد کے معاصرین پر ایک سرسری نظر ڈال لینا ضروری ہوگا۔ احمد جمال پاشا نے آزادیٔ ہند کے بعد ادبی دنیا میں قدم رکھا اور پہلی بار ۱۹۵۰ء میں پاشا نے خود کو بحیثیت ادیب متعارف کرایا۔ پہلی بار ان کا مضمون ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ جس سے پاشا کے ادبی زندگی کی شروعات ہوئی یہ سلسلہ ۳۷ سالوں تک چلتا رہا۔ یعنی ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۷ء تک اس لئے وہ تمام انشائیہ نگار احمد جمال پاشا کے ہم عصر ہوئے جو آزادی سے قبل اور اس کے آس پاس لکھ رہے تھے یا جنھوں نے آزادی کے فوراً بعد لکھنا شروع کیا تھا اور بیسویں صدی کی چھٹی، ساتویں اور آٹھویں دہائی میں ان کے ساتھ ساتھ لکھتے رہے پاشا طنز و مزاح کے مرد میداں تھے لیکن بعد میں انشائیہ نگاری کی طرف خاص توجہ دی۔ دوسرے تمام طنز و مزاح نگاروں کے یہاں بھی انشائیہ نگاری کے غیر ارادی نمونے ملتے ہیں۔ پھر بھی تمام حضرات کا انتخاب کرنا کارِ محال ہوگا۔ اس لئے میں صرف

انھیں انشائیہ نگاروں کا ذکر کروں گا جن کا تعلق احمد جمال پاشا کے ادبی دور سے کسی نے کسی طرح رہا ہے۔ ان میں بالخصوص پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کپور، کرشن چندر، سید ضمیر دہلوی، مرزا محمود بیگ، فکر تونسوی، یوسف ناظم، اندر جیت لال، مجتبیٰ حسین، جاوید وشسشٹ، حسنین عظیم آبادی اور رام لعل نابھوی وغیرہ کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

اردو نثر میں مضمون نگاری کی شروعات انیسویں صدی کے آخر میں باضابطہ طور پر ہو چکی تھی۔ سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد اور ان کے رفقاء نے اردو میں مضمون نگاری کے پودے کو سینچ کر تناور درخت بنا دیا۔ بعد میں مضمون نگاری کا ایک سلسلہ چل پڑا جس میں مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی، ناصر علی، فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی، پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی نے عہد بہ عہد اس روایت کو آگے بڑھایا اور اپنے نوکِ قلم سے اسے صنفی حیثیت دلائی۔ طنز و مزاح کا سہارا لیکر اردو میں ہلکے پھلکے مضامین لکھے گئے۔ جس میں غیر ارادی طور پر انشائیہ کی خصوصیات نمایاں ہیں۔ جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ احمد جمال پاشا نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے جب ادبی دنیا میں قدم رکھا اور مزاحیہ مضمون لکھنا شروع کیا تو اس وقت شوکت تھانوی، پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی وغیرہ کا بول بالا تھا۔ ادبی دنیا میں انھیں کا سکہ رائج تھا۔ اس لئے پاشا بھی ان کے مقلد ہو گئے۔ ان کی ہی روایت کو آگے بڑھانے میں قدمے اور سخنے کوشش کرنے لگے۔ پاشا جیسے حساس ادیب کے سامنے ایک طرف ہندوستان کا سیاسی ماحول تھا تو دوسری طرف مسلمانوں کی کسم پرسی اور بدحالی۔ جس میں اردو زبان و ادب کی بقاء کا دشوار کن مرحلہ تھا۔ تقسیم ہند کے سبب جو تعصب اور نفرت کی آگ ہندوستان میں پھیلی تھی اس کی چنگاری ابھی بھی راکھ کے ڈھیر میں دبی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جس کی گرمی کا احساس ہر حساس ادیب اور حساس شہری کو ہو رہا تھا مگر حالات کے سازگار ہونے تک کا انتظار سبھی کو تھا۔ سیاست اور حکومت کی اتھل پتھل لازمی تھی۔ انگریزی غلامی کی زنجیر اتارنے کے بعد ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ حکومت کے استحکام اور مہاجرین کی سکونت اور روزی روٹی کا مسئلہ کافی اہم تھا۔ جس کی جھلک اس دور کے ادب میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ اردو انشائیہ کا حال بھی ویسا ہی تھا جیسے آزادی کے بعد ہندوستان کا۔ کچھ عرصے قبل ہی یعنی آزادیٔ ہند کے قبل ہی انشائیہ کی شروعات ہوئی اور آزادی کے کچھ سال بعد تک اس میں جمود طاری رہا۔ پھر جب معاشرے میں چین و سکون بحال ہوا تو انشائیہ کی تحریک نے بھی زور پکڑا۔ انشائیہ کی اصطلاح کی بحث سے انشائیہ ایک معمہ بن کر رہ گیا جسے ذہن کی آزاد ترنگ کہا جانے لگا تو کبھی کوئی اسے مجہولیت اور حماقت

تصور کرتا تو کوئی ہلکا پھلکا مضمون تصور کرتا، کوئی اسے خیال کی آوارہ خرامی کہہ کر اس کی تعریف کرتا۔ بہر حال انشائیہ کو سبھی لوگ اپنے اپنے طور پر سمجھنے اور اپنے انداز میں سمجھانے لگے۔ کسی نے یہ بھی کہہ ڈالا کہ انشائیہ کی کوئی خاص ہیئت یا حتمی تعریف کا تعین نہیں کیا جاسکتا بلکہ انشائیہ نگار اسے جس انداز سے برتنا چاہے برتنے کیلئے آزاد ہے۔ بعد ازاں ہندوستان و پاکستان کے ادب میں کچھ جانبداری کا رجحان پیدا ہو گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے تمام روایت سے انحراف کیا اور آنکھ بند کر کے اپنے ادبی اصول اور اس سے متعلق بیانات صادر کرنے لگے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستان میں انشائیہ کا وجود تھا ہی نہیں بلکہ انشائیہ قیام پاکستان کے بعد وجود میں آیا۔ اردو ادب میں آزادی کے قبل وہ استعداد نہ تھی جو انشائیہ کی تخلیق کے لئے درکار ہے۔ اس لئے بقول وزیر آغا اردو ادب میں وہ استعداد قیامِ پاکستان کے بعد پیدا ہوئی جس کے ردِّ عمل کے طور پر اردو انشائیہ وجود میں آیا۔ پاکستان میں اردو انشائیہ کے لئے مناسب ماحول تھا جس سے وہاں کے ادیب متاثر ہوئے اور انشائیے کا سیل رواں پھوٹا جو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔ انشائیہ کی اس تحریک کا سربراہ ڈاکٹر وزیر آغا خود کو تسلیم کرتے ہیں اور ان سے قبل نہ کسی کے پاس انشائی استعداد تھی اور نہ ہی ذہن جدید کہ وہ انشائیہ لکھتا۔ اس لئے وزیر آغا کی تحریک سے لوگوں نے انشائیہ کی راہ اپنائی اور ہندو پاک میں بے شمار انشائیہ نگار پیدا ہو گئے۔ ہندوستان میں انشائیہ پاکستانی ادب سے مستعار لیا گیا اور پاکستانی انشائیہ نگاری کی پیروی میں ہندوستان میں انشائیہ کے طرز میں تبدیلی آئی مگر یہ بات سراسر تنگ نظری کا ثبوت ہے ہندوستان میں انشائیہ نما تحریروں کے نقوش ملا وجہی کے عہد سے ملنے لگے ہیں اور سرسید کے عہد سے باضابطہ طور پر انشائیہ نگاری شروع ہو چکی تھی۔ اس کی تفصیل سے بحث گذشتہ ابواب میں ہو چکی ہے اور نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان میں انشائیہ نگاری کی روایت نثر کی ارتقاء کے ساتھ ہی ساتھ ملتی ہے مگر اس کی باقاعدہ شروعات کافی عرصے بعد اختر اورینوی نے کی لیکن اس سے قبل ہندوستان میں انشائیہ نگار بھی موجود تھے اور انشائیہ نگاری بھی۔ مگر یہ بات بھی سچ ہے کہ انھیں "انشائیہ کیا ہے" کا علم نہ تھا ہر دور میں جو غالب طرزِ تحریر پایا جاتا تھا تمام ادیب اس کی پیروی کرتے تھے اور اس کی متعین حدود، خدوخال یا ہیئت تکنیک کو مدِ نظر رکھ کر ہی وہ کچھ بھی تخلیق کرتے اسلئے اس دور میں جو بھی مضمون نوکِ قلم تک آئے اور زیورِ طبع سے آراستہ ہوئے ان میں غیر ارادی انشائیہ کے نقوش واضح ہیں جس کی بنیاد پر موروثی ادب میں بھی انشائیہ کے وجود کو تسلیم کرنے کی گنجائش ہے۔

احمد جمال پاشا سے قبل مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی، ناصر علی، فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی اور کنہیالال کپور وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ احمد جمال پاشا کے ہم عصروں کے سامنے بھی انشائیہ کا مبہم خاکہ تھا انشائیہ کے تضادات اور تنازعہ کے سبب مختلف بیانات منظرِ عام پر آتے رہتے تھے اور ہر بیان کا اثر اس دور کے ادیب یا انشائیہ نگار پر مرتب ہوتا رہتا تھا انشائیہ کو باضابطہ صنف کی حیثیت سے کافی عرصے کے بعد پہچانا گیا۔ اسلئے دورِ حاضر تک بھی ''انشائیہ کیا ہے'' کہ بارے میں کوئی مستند تعریف منظرِ عام پر نہیں آئی جو قابل قبول ہو ویسے بھی ادب کی کوئی حتمی رائے یا تعریف ممکن نہیں جسکی وجہ یہ ہے کہ ادب متحرک ہے اسلئے تبدیلی لازمی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ادب سماج کا آئینہ بھی ہے۔ سماج میں تبدیلی ہوگی تو ادب میں بھی تبدیلی ہوگی جس سے ادب میں مختلف رجحانات آتے جاتے رہتے ہیں ادب میں سماج، ماحول اور حالات کے مطابق تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔ جس سے کوئی بھی تعریف مکمل نہ ہو سکی بلکہ ادب کی تعریف ہر عہد اور ہر دور میں کرنا لازمی ہے جس سے ادب کو نئے پس منظر میں اس عہد کے زاویئے سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ انشائیہ کے ساتھ بھی معاملہ وہی ہے انشائیہ تمام پابندیوں سے آزاد ہونے کی وجہ سے ایک طرزِ تحریر اور اسلوب بیان کی سطح سے اٹھ کر صنفی حیثیت سے جانا پہچانا جانے لگا۔ مگر اس کی شناخت طرزِ تحریر یا اسلوب بیان سے ہی ہوتی ہے اکثر و بیشتر ادیب کے یہاں انشائیہ کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے اسلئے احمد جمال پاشا کے ہم عصروں کے یہاں انشائیہ کی نشاندہی کر کے انکا موازنہ پاشا سے کرنا ہوگا۔ جس سے یہ بات واضح ہوگی کہ احمد جمال پاشا اور ان کے ہم عصروں کی انفرادیت کیا تھی؟ یا کس طرح مماثلت رکھتے ہیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ان کے انشائیے کہاں تک عصری تقاضوں کو پورا کرتے ہیں یا اپنے سماج کی آئینہ داری کرتے ہیں جس کا ذکر الگ الگ کرنا بہتر ہوگا۔

احمد جمال پاشا کے ادبی سفر کی شروعات کے پندرہ سال بعد مضامین کا مجموعہ ''اندیشۂ شہر'' شائع ہوا۔ جس میں انشائیے بھی شامل ہیں۔ ان کا آخری مجموعہ ''پتیوں پر چھڑکاؤ'' ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ اس درمیان میں کئی اور دوسرے انشائیے بھی ہندوستان و پاکستان کے ادبی رسائل میں شائع ہوئے مگر وہ کتابی شکل میں منظرِ عام پر نہ آسکے۔ اسلئے ۱۹۶۰ء کے بعد کے تمام انشائیہ نگار ان کے ہم عصروں کی فہرست میں شامل کئے جاسکتے ہیں مگر خالص انشائیہ نگار کی تعداد معدود چند ہے بلکہ وہ تمام حضرات جو طنز و مزاح نگار ہیں، مضمون نگار ہیں ساتھ ہی ساتھ انشائیہ نگار بھی ہیں یوں تو انشائیہ نگاری کی روایت بھی اب پرانی ہو چکی ہے مگر پاشا کے ادبی عہد کے کچھ عرصہ قبل پطرس بخاری،

رشید احمد صدیقی اور کنہیالال کپور یہ تین نام کافی اہم ہیں جن کا سرسری جائزہ لینے سے اس عہد کے رجحان طرزِ تحریر اور اندازِ فکر سے ان کی شخصیت کے مخفی پہلو نمایاں ہوں گے۔

پطرس بخاری:

اردو ادب میں پطرس بخاری کی شخصیت واحد شخصیت ہے جس نے لکھا کم اور شہرت زیادہ پائی جس کی وجہ ان کی طرزِ تحریر یا اندازِ بیان ہے۔ پطرس بخاری نے تمام روایتوں کو منقطع کر دیا۔ طنز و مزاح کے بارے میں یہ بات عام طور سے دہرائی جاتی تھی کہ یہ دوسرے درجہ کا ادب ہے اس فرق کی وضاحت پطرس نے اپنے بیش بہا اور مشہور زمانہ مضامین لکھ کر کر دی۔ پطرس بخاری کا عہد ترقی پسندی سے تقسیمِ ہند کا زمانہ تھا ان کے عہد میں ادبی اتھل پتھل، روایت سے بغاوت کا ایک غالب رجحان پیدا ہو چکا تھا جس کی قیادت ترقی پسند ادیب کر رہے تھے۔ دوسری طرف ان کے سامنے انگریزی سامراجیت اور بربریت تھی جو ہندوستانی عوام کو جانور سے بدتر سمجھتی تھی اور انھیں غلامی کی زنجیر سے جکڑ کر رکھنا چاہتی تھی۔ تیسری طرف ہندوستانی عوام اور ہندوستان کا معاشرہ تھا جہاں انسان یا تو اپنی غریبی کا رونا روتا تھا یا امیری و عیش پرستی سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس مثلثی عہد میں پطرس کی ذہنی پرداخت ہوئی۔ جس کے ردِ عمل کے طور پر ان کے صرف گیارہ مضامین، منظرِ عام پر آئے جس میں انھوں نے اپنے عہد کو سمیٹ لیا۔ پطرس بخاری کو سمندر کو کوزہ میں بند کرنے کا ہنر آتا تھا۔ زبان و بیان پر قدرت کا عالم یہ تھا کہ لفظی الٹ پھیر سے اور واقعات کے پس منظر سے وہ ایسی فضا تیار کرتے کہ تبسم زیرِ لب کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ ''مضامین پطرس'' کے کچھ مضامین انشائیہ کے بالکل قریب ہیں جن میں اسلوب بیان اور طرزِ تحریر کا غالب رجحان پایا جاتا ہے۔ بے بات کی بات میں کوئی نہ کوئی ایسا گوشہ نمایاں کر دیا ہے جس سے قاری پر مخفی مفاہیم آئینہ ہو گئے ہیں۔ ''کتے'' ان کا ایک مشہور انشائیہ ہے جس میں وہ مختلف موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ مگر مرکزی نقطہ سے بھٹکتے نہیں بلکہ وہ کتے کی علامت کا استعمال کر کے سماجی برائیوں اور اس کے چھپے ہوئے پہلوؤں کو منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ ''مرید پور کا پیر'' اور ''میں ایک میاں ہوں'' وغیرہ کا شمار تو انشائیے میں کیا جا سکتا ہے۔ جس میں طنز و مزاح کا رجحان کم اور اسلوب بیان کی رنگارنگی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے ''کتے'' ایک شاہکار تحریر ہے ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

''علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا' سلوتریوں سے دریافت کیا'

خود سر کھپاتے رہے لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا کیا فائدہ ہے۔ گائے کو لیجئے دودھ دیتی ہے، بکری کو لیجئے دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اسی کا نام ہے کہ شام کے وقت سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا لگا تار بغیر دم لئے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے ہی چلے گئے۔" (۱)

پطرس واقعات سے مزاح پیدا کرتے ہیں جس سے ان کی تحریریں شگفتہ اور تبسم آمیز ہو جاتی ہیں۔ انکشافِ ذات' اختصار بیان' شگفتگی اور سادگی ان کی تحریروں میں اکثر بیشتر ملتی ہیں۔ پطرس کا مطالعہ وسیع ہے جس سے خیالات میں ندرت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے موضوعات کو ڈرامائی انداز میں پیش کرنے میں ماہر ہیں۔ الفاظ کا جال ایسا بچھاتے ہیں کہ قاری اس کی گرفت میں آجاتا ہے۔ تبسم زیر لب سے لیکر قہقہہ بازی تک سب کچھ ان کی تحریروں میں موجود ہوتا ہے۔ ان کا ایک ہی مجموعہ ان کے طرز بیان اور انداز فکر کی عمدہ مثال ہے۔ ۱۹۵۹ء میں اس دار فانی سے کوچ کیا۔

رشید احمد صدیقی:

رشید احمد صدیقی کا عہد پہلی جنگ عظیم کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ان کا ادبی سفر تقریباً پچاس سال تک چلتا رہا۔ نصف صدی کے ادبی محاسبے میں رشید احمد صدیقی بطور محقق' تنقید نگار' طنز و مزاح نگار اور انشائیہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں ان کا شمار ایک صاحب طرز نثر نگار میں ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے مضمون لکھنا شروع کیا۔ غالباً ۱۹۲۱ء میں پہلی بار ان کا مضمون علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا اور پھر یہ سلسلہ تا حیات جاری رہا۔ علی گڑھ سے کافی رغبت تھی جس کی جھلک ان کی تحریر میں ملتی ہے۔ انشائیہ نگاری ایک فن اور فنکاری ہے جس کی بنیاد لفظی بازی گری و جادوگری پر استوار ہوتی ہے۔ یہ ایک ذہنی ترنگ ہے جس میں ایک خاص قسم کی لطافت اور شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ بات سے بات پیدا کرنے یا انکشاف ذات میں طنز و مزاح کا استعمال انشائیہ نگار سہارے کے طور پر کرتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے دونوں مجموعے "مضامینِ رشید" اور "خنداں" کے کچھ مضامین جن کی حدود انشائیہ سے ملتی ہیں متذکرہ بالا باتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ بات سے بات پیدا کرنا خوب جانتے ہیں۔ انشائیہ کے فن کو وسعت و جامعیت عطا کرنے میں ان کا بہت حصہ

رہا ہے وہ بات سے بات پیدا کرتے ہوئے بڑی سے بڑی بات کو اشاروں اشاروں میں اس طرح ادا کر جاتے ہیں کہ عام قاری کو ان کے طنز کا احساس ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ محض مزاح سمجھ کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ "لیڈر" کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے جس میں انشائیہ کا غالب رجحان ہے مگر ساتھ ہی ساتھ طنز و مزاح سے بھی کام لیا ہے۔ "ارہر کا کھیت" ان کا ایک مشہور زمانہ انشائیہ ہے جس میں انھوں نے پارلیمانی امور کا موازنہ گاؤں کی اس گپ بازی سے کیا ہے جہاں کھیتوں کی میڑھوں پر "الاؤ یا گھور" کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے لوگ زمین و آسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہیں جس کا نہ کوئی سر ہوتا ہے نہ کوئی پیر۔ پھر بھی اسکے پس منظر میں کچھ نہ کچھ حقیقت اور دونوں میں کچھ مماثلت ہوتی ہے۔ کسی موضوع کے مبہم مفاہیم کو زاویۂ نگاہ بدل کر دیکھنے کی کوشش بھی انہوں نے کی ہے مثلاً چار پائی جسے عام انسان صرف چار پیروں والی یا پھر تھک ہار کر آنے کے بعد آرام کرنے کا سامان سمجھتا ہے مگر رشید احمد صدیقی نے اس کا موازنہ معاشرے کے اتحاد سے کیا ہے۔ قومی اور سماجی کلچر سے کیا ہے اور چار پائی کو سماج کی بنیادی قدروں کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے جس سے ایک نئے گوشے کا اضافہ ہوتا ہے جو کسی چیز کو الٹ پلٹ کر یا اپنی جگہ پر سے ہٹ کر دیکھنے میں ہوتا ہے۔ رشید صاحب نے موازنہ سے انشائی رنگا رنگی پیدا کی ہے مثلاً "لیڈر" اور "ارہر کا کھیت" "لیڈر میں لیڈر کا موازنہ امراض کے انواع و اقسام سے کیا ہے اور پارلیمنٹ کا ارہر کے کھیت سے کیا ہے جس سے انکے انشائیوں کی خصوصیات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ موازنہ اور مماثلت ان کے اکثر و بیش تر انشائیوں کے موضوعات میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کا لب و لہجہ خالص ادبی ہے۔ زبان و بیان میں پختگی ہے۔ مضامین میں علمی شان جھلکتی ہے۔ عام ذہنی سطح سے اوپر اٹھ کر لکھتے ہیں۔ مطالعہ وسیع تھا جس کا اثر ان کے طرز تحریر پر تھا۔ انشائیوں میں طوالت اور گہرائی بھی دیکھنے میں ملتی ہے۔ کہیں کہیں فن اور فکر کی پختگی بالیدگی اور طوالت سے ان کے یہاں انشائیہ کا فن مجروح ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ چند ایسے مضامین لکھے ہیں جن کو ہم انشائیہ مان سکتے ہیں۔ مثلاً" چار پائی اور کلچر" "لیڈر" "ارہر کا کھیت" "پاسبان" "مرشد" اور" گھاگھ" میں ان کے طرز بیان کی رنگا رنگی اور اسلوب کی شگفتگی ملتی ہے۔ ۱۹۷۷ء میں راہیٔ ملک عدم ہوئے۔"

کنہیا لال کپور:

کنہیا لال کپور نے اپنے ادبی سفر کی شروعات اس دور میں کی جب ترقی پسندی کی شروعات

ہوئی مگر انھوں نے ترقی پسند تحریک کی حمایت نہیں کی بلکہ اس پر ضرب لگائی ان کا مشہور زمانہ مضمون ''غالب جدید شعراء کی محفل میں'' اس کی عمدہ مثال ہے جس میں جدید شاعری پر مخصوص انداز میں کنہیالال کپور نے طنز کیا ہے۔ اسلوب بیان سادہ، سلیس اور شگفتہ ہے۔ زبان و بیان میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ ''اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے'' ان کی ایسی تحریر ہے جو بظاہر طنز کا نمونہ ہے مگر اس کے پس پردہ انشائیہ کے مخفی مفاہیم کارفرما نظر آتے ہیں وہ ایک مرکزی موضوع کے تحت مختلف چھوٹے چھوٹے موضوعات کو اپنی تحریر میں جگہ دیتے ہیں بے بات کی بات میں بڑی سے بڑی بات کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹے جملے میں بڑی سے بڑی بات کی طرف اشارتاً طنز کر دیتے ہیں زبان و بیان کے اعتبار سے یا دعوتِ فکر کے اعتبار سے موضوع کی رنگارنگی یا موضوع کے تنوع کے اعتبار سے، اختصار کے اعتبار سے یا دعوتِ فکر کے اعتبار سے اس میں انشائیہ کے جوہر ملتے ہیں جو کافی حد تک انشائیہ کے فنی محاسن کے قریب ہیں۔ طرزِ تحریر اور منفرد انداز بیان کے اعتبار سے کپور کی یہ ایک شاہکار تصنیف ہے۔ کپور کے تقریباً آٹھ مجموعے شائع ہوئے جس میں طنز و مزاح کا رنگ غالب نظر آتا ہے مگر ان میں جابجا غیر ارادی طور پر انشائیہ کی مختلف خصوصیات دکھائی پڑتی ہے جو عام روایت کی بنیاد پر انشائیہ نما تحریریں قرار دی جاسکتی ہیں۔ کپور کا انتقال ١٩٨٠ء میں ہوا۔

پطرس، رشید احمد صدیقی اور کنہیالال کپور اپنے ادبی سفر کی ڈھلان پر تھے اور ان کے فن میں پختگی، پائیداری اور بالغ نظری و بالیدگی پیدا ہو چکی تھی جس سے وہ معاشرہ کو بہ خوبی دیکھتے اور اس کا عکس اپنی تحریروں میں بہ آسانی پیش کر دیتے ان کی تحریروں میں اکثر و بیشتر طنز کے عنصر نمایاں تھے۔ طنز و نشتریت کا رجحان ان کی تحریروں میں غالب آچکا تھا۔ پاشا نے بھی اس دور میں جو مضامین لکھے ہیں ان میں طنز ملتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ انشائیہ کا غیر واضح تصور بھی اس کے پس پردہ دکھائی دیتا ہے۔ جسکا ازالہ ان کی بعد کی تحریروں میں ملتا ہے۔ پاشا کا کمالِ فن یہ ہے کہ انھوں نے موقع کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیشہ عصری تقاضوں کو پورا کیا جبکہ متذکرہ بالا تینوں ادیبوں نے اپنی روایت سے بغاوت نہیں کی اور نہ ہی اپنی راہ بدلی بلکہ وہ جس سمت کا تعین کر چکے تھے ابتداء تا انتہا اس سمت میں گامزن رہے جبکہ پاشا نے ہمیشہ نئے نئے راستے تلاش کئے۔ نئی پگڈنڈیوں پر خود بھی چلے اور دوسروں کے لئے بھی راہیں ہموار کیں جو ان کی ادبی اختراع کی مثال ہے۔ ان تینوں ادیبوں کے ذکر کے بعد ایک ایسے افسانہ نگار یا ناول نگار کا ذکر کرنا ہوگا جو اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مگر اس نے

اپنی شناخت اردو فکشن میں بنائی جس سے اردو ادب میں اسے ناول نگار افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت ملی مگر اس کے اندر ایک انشائیہ نگار بھی چھپا ہوا تھا جو اس کی رومانی اور مزاحیہ تحریروں میں کبھی کبھی اپنی ایک جھلک دکھا جاتا۔ میری مراد کرشن چندر سے ہے۔

کرشن چندر:

کرشن چندر اردو ادب میں محتاج تعارف نہیں ہیں بلکہ اردو کے افسانوی ادب میں کرشن چندر کو بسیار نویس کہا جاسکتا ہے۔ کسی بھی چیز کی زیادتی اچھی نہیں ہوتی مگر کرشن چندر نے افسانوی ادب میں سب سے زیادہ لکھا لیکن ان کی کوئی بھی تخلیق ایسی نہیں جسے غیر معیاری قرار دیا جاسکے بلکہ ان کی تمام تخلیق اوسط درجے سے بھی اعلیٰ معیار کی چیز ہے۔ افسانہ، ناول کے ساتھ ساتھ کرشن چندر نے کچھ ایسی تحریریں بھی چھوڑیں جس کو ہم انشائیہ کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ ''ہوائی قلعے'' کرشن چندر کا ایک ایسا منفرد مجموعہ ہے جس میں چند مضامین ایسے ہیں جن کو ہم انشائیہ تسلیم کر سکتے ہیں اس میں طنز بھی ہے۔ مزاح بھی ہے کچھ افسانے بھی ہیں اور کچھ انشائیے بھی۔ کرشن چندر کا مطالعہ بڑا گہرا ہے۔ انھوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو قریب سے دیکھا اور اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے۔ کرشن چندر کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دو متضاد عناصر کو اکثر ایک جگہ جمع کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر رومان اور مزاح میں ایک دوسرے کی تردید کرنے کی صفت موجود ہے مگر کرشن چندر کے یہاں رومان، حقیقت اور مزاح اچھے ہمسایوں کی طرح رہتے ہیں۔ کرشن چندر کی شگفتہ تحریروں میں انسانی دوستی، ذہانت، شائستہ اور سادہ طرز بیان نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں ان کی تحریروں سے ان کی قوت مشاہدہ اور وسیع مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔ کرشن چندر کی تحریروں میں خیال کی آوارہ خرامی بھی ہے اور موضوع کی رنگارنگی بھی ہے۔ کہیں کہیں تحریروں میں بوجھل پن پیدا ہو جاتا ہے جس کی بنیاد پر ہم انکی تحریروں کو مکمل انشائیہ نہیں مان سکتے ہیں بلکہ انشائیہ کے تیور ان کی تحریروں میں غالب معلوم ہوتے ہیں۔ جس کی مثال ''ہوائی قلعے'' میں موجود ہے۔ غلط فہمی، جان پہچان، غسلیات، بدصورتی، رونا، شادی، عشق، آنکھیں، باون ہاتھی، مانگے کی کتابیں اور ہوائی قلعے'' وغیرہ اس کے علاوہ بھی ان کے کئی افسانوں میں طنز و مزاح کی تیز آنچ محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً گھونگھٹ میں گوری جلے گل فروش اور ''بے رنگ و بو'' وغیرہ اس کے علاوہ گدھے کی سرگذشت ان کے طنزیہ مزاحیہ تحریر کا عمدہ نمونہ ہے۔ گدھے کی سرگذشت کے جواب میں احمد جمال پاشا نے ''گدھے کا خط کرشن چندر کے نام'' ایک

پیروڈی لکھی۔ دونوں میں کہیں کہیں انشائیہ کی خصوصیات ملتی ہیں یعنی بے بات کی بات میں پتے کی بات دیکھنے کو ملتی ہے۔ زبان وبیان پر کرشن چندر کو قدرت حاصل ہے جس سے انھوں نے اپنا انفرادی اسلوب اختراع کر کے اپنی شناخت غیر افسانوی نثر میں قائم کر لی۔ احمد جمال پاشا نے بھی اقتصادی ناہمواریوں، غیر انسانی صورت حال اور سماج وسیاست کے تازہ ترین مسائل کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا اور طنز کے نشتر لگائے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ کئی موضوعات کو بھی اپنی تحریر میں جگہ دے کر دعوت فکر دیتے ہیں۔ کرشن چندر اور احمد جمال پاشا میں غیر منطقی ربط، بے بات کی بات، زبان و بیان میں سادگی اور شخصی ردعمل کی سطح پر کافی مماثلث ہے۔ ان کا عہد بھی اتنا طویل ہے کہ یہ احمد جمال پاشا کے ہم عصروں میں شامل ہیں۔

فکر تونسوی:

فکر تونسوی اور احمد جمال پاشا کے ہم عصر ہونے کی ضمانت ان کی وفات ہے یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں کا انتقال ۱۹۸۷ء میں ہوا اور دونوں تاحیات اپنے قلم کی لڑائی لڑتے رہے۔ آزادیٔ ہند سے قبل فکر تونسوی نے شاعری سے اپنا ادبی سفر شروع کیا مگر کچھ طبیعت کا قصور تھا تو کچھ حالات و ماحول کا اثر کہ انکی شاعری اور کمال فن تک ان کے سامعین کی رسائی نہ ہو سکی جس کا اعتراف خود فکر نے کیا ہے اپنی مشکل گوئی پر خود فکر بھی فکر مند تھے کہ جب تک ناظرین اور سامعین کے معیار کا خیال نہ رکھا جائے گا۔ شاعر کی حیثیت سے شناخت مشکل ہے اس کشمکش نے انھیں اپنی راہ بدلنے پر آمادہ کر لیا۔ شاعری کی دنیا کو سلام کیا اور نثر کی دنیا میں قدم رکھا۔ طنز و مزاح کی طرف خاص دھیان دیا بہت جلد ہی کالم نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت متعین کر لی۔ تقسیم ہند کے بعد کچھ عرصے تک پاکستان میں مقیم رہے۔ مگر مذہبی تعصب اور تقسیم ہند کی بربریت سے مجبور ہو کر وہ ہندوستان واپس آ گئے۔ روز نامہ ''ملاپ'' میں '' پیاز کے چھلکے'' کے عنوان سے برابر تاحیات کالم لکھتے رہے۔ اسکے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا مگر اسی پیاز کے چھلکے سے وہ پہنچانے جاتے تھے۔ پیاز کے چھلکے اتارنے میں فکر تونسوی کے اندر چھپا ہوا انشائیہ نگار بھی کبھی کبھی ان کی نوک قلم تک آ پہنچتا جسے وہ الفاظ کے زیور سے آراستہ کر کے عام قاری کی عدالت میں پیش کر دیتے۔ انشائیہ نگاری کا فن بھی پیاز کے چھلکے اتارنے کا فن ہے بظاہر انشائیہ میں انھیں موضوعات کو چنا جاتا ہے جو روز مرّہ اور عام زندگی میں روزانہ نظروں کے سامنے سے گذرتے ہیں مگر انشائیہ نگار کا کام یہ ہے کہ وہ ہمیں اس تکرار سے الگ کر کے اس موضوع کے کسی

ایسے مخفی مفاہیم اور گوشے سے ہمیں آشنا کرائے جس سے قاری کے علم میں اضافہ ہو سکے اور اس کے ختم ہونے کے بعد قاری کو ایسا لگے کہ اسے کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہو۔ فکر تونسوی کی زبان میں سادگی، سادگی کے باوجود ادبیت بھی ہے سیدھی سادی زبان میں ان کا قلم ایسے جملوں کی تراش و خراش پر قادر ہے جو ضرب المثل کی طرح معلوم ہوتے ہیں مثلاً ان کا یہ جملہ ملاحظہ ہو'' بیوی ایک لطیفہ ہے جو دہرانے سے باسی ہو جاتا ہے۔'' فکر تونسوی اکثر دو بظاہر چیزوں کے موازنہ سے مزاح پیدا کرتے۔ الفاظ کی بازیگری کے ذریعہ مزاح پیدا کرنا انھیں اچھی طرح آتا ہے۔ فکر تونسوی کی تحریروں میں انکشاف ذات اور شخصی ردعمل کی مثالیں جابجا ملتی ہیں۔ فکر کے انداز فکر کا سب سے نمایاں پہلو خود ان کی اپنی ذات ہے جس کو وہ اپنی تحریر کا موضوع بنا کر اسے محور مان کر اس کے ارد گرد طواف کرتے رہتے ہیں۔ طنز و مزاح میں اکثر طنز نگار خود اپنی ذات کو ہی نشانہ بناتا ہے اور دنیا کی بے ثباتی پر طنز کرتا ہے۔ فکر خود اپنی ذات کو ہدف بنا کر اپنی خاندانی زندگی کا ذکر بھی بڑے اچھے انداز سے کرتے ہیں۔ کئی جگہوں پر فکر نے اپنی شریک حیات اور اکثر و بیشتر خود پر بھی چند چست درست جملے کس دیئے مثلاً واہ گھڑی آہ گھڑی'' بیماری کے فائدے اور فکریات وغیرہ میں ان کے اس انداز بیان سے ان کے اندر چھپا ہوا انشائیہ نگار قاری کے سامنے آ جاتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو انھوں نے '' پیاز کے چھلکے'' چھلکے ہی چھلکے'' میں بڑے اچھے انداز میں اپنا موضوع بنایا ہے اور لفظی تراش و خراش سے اس موضوع کی پُر اسرار اور مخفی پہلو کو ابھارنے کی کوشش کی'' پیاز کے چھلکے'' میں ایک جگہ آگ کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> آپ سب جانتے ہیں کہ آگ کیوں ایجاد ہوئی، انسان بدھو نہیں تھا کہ آگ ایجاد کرتا اور اس سے کھانا پکاتا پانی نہ گرم کرتا، بدن نہ سینکتا، کپڑے نہ سکھاتا، لیکن بعد میں نہ جانے انسان کو کیا ہوا کہ اچانک بدھو بن گیا اور اس سے پڑوسی کے گھر کو آگ لگانے لگا دشمنی کی فصل جلا کر راکھ کر دی۔ مٹی کا تیل بدن پر ڈال کر اپنے آپ کو آگ لگا لی اور پھر اس مقصد کے لئے ایک بی جمالو بھی پیدا کر دی جس کا کام بھس میں چنگاری ڈال کر تماشہ دیکھنا تھا ایک طرف ہم آگ کی پوجا کرنے لگے دوسری طرف اس آگ سے پوجا سکھانے والی کتابوں کی لائبریریاں پھونک ڈالیں۔'' (۲)

دوسری جگہ '' روٹی'' پر یوں رقم طراز ہیں:

''روٹیاں جن کے لئے صلیبی جنگیں لڑی گئیں اور جن کے لئے ہیروشیما پر ایٹم بم پھینکا گیا۔ وہی روٹیاں آج مجھے چاندنی چوک میں دکھائی دیں اور کوے کائیں کائیں کرتے ہوئے روٹیوں کی اس تاریخی لاش پر حریفانہ نظر ڈال رہے تھے۔'' (۳)

ان دونوں اقتباسات پر نظر ڈالنے سے فکر کی انشائیہ نگاری کا احساس ہوتا ہے وہ کسی ایک موضوع کے مختلف گوشوں کو نمایاں کرتے اور بے بات کی بات سے پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔

یوسف ناظم:

پیدائش غالباً ۱۹۲۱ء اور ادبی سفر کی شروعات ۱۹۴۴ء میں ہوئی مزاجاً مزاح نگار ہیں ہمیشہ چست فقرہ کسنے کی عادت ہے خواہ اس سے اپنی دل آزادی ہی کیوں نہ ہو مگر حاضر جوابی غضب کی ہے۔ زبان وبیان کی مہارت کا احساس ان کی عملی زندگی اور ادبی زندگی میں جا بجا ہوتا ہے۔ زبان کی قدرت کا ہمیشہ وہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ روتے ہوئے کو ہنساتے ہیں اور ہنستے ہوئے کو سنجیدگی سے دعوت فکر کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔ ان کے اسلوب کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے اور کافی چست درست جیسے ترشے ترشائے جملے تحریر کرتے ہیں جس سے ان کی تحریر میں بلا کی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے قاری کو حظ حاصل ہوتا ہے اور ان کے اسلوب کی گرفت اتنی مضبوط کہ اس سے چھٹکارا پانا مشکل ہو جاتا ہے بلکہ تجسس اور تشنگی بڑھتی جاتی ہے۔ جس کا ازالہ وہ خود بھی اشارتاً قوسین میں کرتے جاتے ہیں۔

یوسف ناظم اردو ادب اور طنز و مزاح میں ایک ایسا نام ہے جس نے آزادی سے قبل کے ادب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور احساسِ قلم سے اس کی تصویر بنائی تقسیم ہند کے اندوہ ناک حالات سے متاثر ہوئے ہیں پھر جب ادب میں نئی نئی روایتوں کی شروعات ہوئی تو اس سے از اول تا آخر واقفیت رکھتے ہیں یعنی اردو انشائیہ کی ابتداء تقریباً ۱۹۴۴ء میں ہوئی۔ یوسف ناظم کے ادبی سفر کا آغاز بھی تقریباً اسی دوران ہوا جیسے آج انشائیہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اردو ادب میں بحیثیت ایک صنف پہچانی جاتی ہے ٹھیک ویسے ہی یوسف ناظم بھی اردو ادب میں اپنی پہچان بنا چکے ہیں۔ ان کی عبارت صفائی اور سادگی سے پُر ہے ان کی نظر معاشرے کی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر پڑتی ہے جس سے تیز رفتار زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل اور ہنگامی واقعات ان کے قلم اور فکر و نظر کی گرفت

میں بہت آسانی سے آجاتے ہیں۔ قینچی، انتظار، شور نہ کیجئے اور دولت خانہ وغیرہ میں سماجی زندگی کی جولانیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بظاہر ایک مزاح نگار ہیں۔ کالم نگاری سے بھی انکا تعلق ہے۔ مبصر اور مدیر بھی ہیں، شاعری سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ یوسف ناظم انکا تخلص ہے مگر ان سب سے الگ اپنی تحریر، اسلوب اور انداز بیان کی وجہ سے موضوعات کے تنوع اور آزاد خیالی کی وجہ سے ان کی تحریریں انشائیہ کے بہت قریب ہیں۔ ان کے انشائیے مختصر اور جامع ہوتے ہیں۔ ان کا آرٹ مختصر نویسی کا ہے وہ طوالت کی تاب نہیں لا پاتے جس کی شاید ایک وجہ یہ ہے کہ لوگ زندگی بھر رو سکتے ہیں مگر دیر تک ہنس نہیں سکتے۔ یوسف ناظم کے خالص انشائیوں کا کوئی مجموعہ ۱۹۹۰ء تک شائع نہیں ہوا ہے مگر ان کی بکھری ہوئی تحریروں میں انشائیوں کی رنگارنگی ملتی ہے جو نہ صرف اردو کے مزاحیہ ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے بلکہ اس سے ہمارے انشائی ادب میں ایک نئی راہ کا تعین ہوگا۔ جس سے آنے والے زمانے میں نئے لکھنے والوں اور انشائیہ نگاروں کے لئے راہ ہموار ہوگی۔

اندر جیت لال:

اندر جیت لال پاکستان میں پیدا ہوئے آزادی کے بعد ہندوستان چلے آئے اور دہلی میں اقامت گزیں ہوئے۔ ابتدائی زندگی کی روداد کافی المناک ہے مگر یہ مرد مجاہد تھے۔ اپنے روٹی روزی کا انتظام خود کیا اور اسی درمیان اپنی تعلیم مکمل کی۔ ایم۔ اے انگریزی اور جرنلزم کی ڈگری لی۔ بطور صحافی انگریزی اخباروں اور اشاعتی اداروں میں رہے۔ مکمل طور پر انگریزی کے آدمی تھے مگر ساتھ ہی یہ پنجابی اور اردو میں خوب لکھتے رہے۔ اردو میں مختلف موضوعات پر علمی اور غیر سنجیدہ تمام قسم کی کتابیں لکھیں اور ترتیب دیں۔ اردو کی تمام اصناف ادب کے علاوہ انشائیہ سے خاصا لگاؤ رہا۔ بعد میں صحافتی دنیا سے سبکدوش ہو کر ریڈیو سے جڑ گئے۔ مختلف موضوعات پر ان کے مضامین و انشائیے ریڈیو سے نشر ہوئے۔ تین دہائی کے ادبی سفر میں انھوں نے انشائیہ کے ضمن میں چند مضامین لکھے۔ ان کی پہلی مرتب کروہ کتاب ''مسکراہٹ ہی مسکراہٹ'' جس میں ان کا انشائیہ ''مسکراہٹ ہی مسکراہٹ'' شامل ہے بقیہ دیگر ادیبوں کا انتخاب ہے۔ دوسری کتاب جانور سے انسان تک'' ان کے مضامین و انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ اندر جیت لال کو موضوع کے انتخاب میں انفرادیت حاصل ہے وہ اکثر گمنام، خشک اور کھردے موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں۔ کبھی حیوانات تو کبھی زراعت اور کبھی سائنس جیسے موضوعات کو بھی اپنی طرز تحریر اور اسلوب بیان سے رواں دواں پر لطف اور غیر سنجیدہ

بنادیتے ۔ جسے عام آدمی پڑھکر بہ آسانی لطف اندوز ہوتا ہے۔ زبان و بیان کی تراکیب کو عام فہم اور دل نشیں پیرائے میں ڈھالنے میں مہارت حاصل ہے۔ "پرتاپ" اور "بندے ماترم" میں ملازمت کے دوران کالم نویسی بھی کی جس کی وجہ سے مزاج میں طنزومزاح کے کچھ جوہر نمایاں ہو گئے۔ طنز و مزاح کی طرف ان کا رجحان بڑھا۔ کالم نویس کو اکثر و بیشتر روز مرہ کے حالات، پریشانیوں، دشواریوں اور نوازشات سے سابقہ پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ حسب ضرورت اپنے قلم میں طنز کی مزاح کی اور تعریف کی روشنائی بھر لیتے اور اپنی اخباری پالیسی کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب طرز تحریر اپناتے ۔ زیادہ تر اس میں طنزومزاح ہوتے ہیں اس لئے ہر ایک جو طنزومزاح نگار ہے وہ کہیں نہ کہیں اخبار کے کالم سے ضرور جڑا ہوا ہوتا ہے۔ اندر جیت لال بھی اپنے سہ زبانی فارمولے کے تحت تمام زبانوں میں اپنی تحریر کا جادو جگاتے ہیں۔ اردو، انگریزی اور پنجابی کے مصنف ہونے کے سبب ہندوستانی ادب میں ان کی اپنی الگ ایک پہچان ہے انھوں نے بزرگوں کے لئے، بچوں کے لئے اور ملک کے جوانوں کے لئے کچھ ایسی تحریریں چھوڑی ہیں جو بظاہر ہلکی پھلکی اور نرم و شگفتہ ہیں مگر اس میں غوطہ لگانے والوں کو موتی ضرور ملتا ہے۔

اندر جیت لال اور احمد جمال پاشا میں طرز بیان، موضوعات کے انتخاب اور طنزومزاح کے سبب کافی یکسانیت ہے ادبی سفر میں دونوں کا عہد تقریباً ایک ہے۔ ہجرت اور منتقلی دونوں نے کی جس کا عکس ان کی تحریروں میں دیکھنے کو ملتا ہے ایک نے بیرونِ ہند اور دوسرے نے اندرونِ ہند ادب اطفال، انشائیہ نگاری اور کالم نویسی میں دونوں میں یکسانیت تھی۔ اندر جیت لال نے ایک انشائیہ پھل، پھول اور اناج لکھ کر اپنی انفرادیت کا لوہا منوالیا ہے۔ جس کی دوسری مثال نہیں ملتی یہ غیر سنجیدہ اور علمی مضمون ہے مگر صرف اسلوب کی شگفتگی اور طرز تحریر نے اسے انشائیہ بنادیا۔ اس میں گیہوں، آم اور گلاب کے بارے میں کچھ اس انداز سے لکھا ہے کہ اس میں غیر سنجیدگی اور بے ربطی پیدا ہوگئی ہے۔ گیہوں، آم اور گلاب جیسے خشک موضوع پر اس انوکھے انداز سے کچھ بھی تحریر کرنا ہی ان کی انفرادیت کی دلیل ہے۔ مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ اندر جیت لال کی مادری زبان اردو نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اچھی اردو (جسے ہم خالص، سادہ اور سلیس اردو کہہ سکتے ہیں) لکھتے رہے ان کی ادبی صلاحیت اور زبان و بیان پر ان کی قدرت قابلِ تعریف ہے۔

مجتبیٰ حسین:

مجتبیٰ حسین نے اپنے ادبی سفر کی شروعات طنزومزاح سے کی بعد میں طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے ساتھ ساتھ خاکہ نگاری بھی شروع کی۔ خاکہ نگاری میں وہ عظیم ہستیوں کی بھی بخیہ ادھیڑنے میں ہچکتے نہیں۔ دور حاضر میں وہ ایک واحد خاکہ نگار ہیں جنھوں نے باضابطہ طور پر خاکہ نگاری کی طرف توجہ دی۔ " آدمی نامہ اور چہرہ در چہرہ" ان کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ وہ رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں۔ چھوٹی سی بات بھی ان کے قلم کی زد میں آکر ایک معنی خیز شکل اختیار کر لیتی ہے۔ "تکلف برطرف" مجتبیٰ حسین کا ایک باغ و بہار مجموعہ ہے جس میں انھوں نے بڑی بے تکلفی سے کام لیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے تعارف کی رسم بھی خود سے ادا کی ہے۔ مجتبیٰ حسین "روزنامہ سیاست" حیدرآباد کے مزاحیہ کالم تیشہ و شیشہ" کے کالم نویس بھی ہیں۔ طنزومزاح سے ان کا خاندانی رشتہ ہے یہ ابراہیم جلیس کے چھوٹے بھائی ہیں جنھوں نے اردو ادب میں "الٹی قبر" اور "پتے کی بات" لکھ کر قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ گویا مجتبیٰ حسین خاندانی طنزومزاح نگار ہیں ان کے یہاں ظرافت کا فطری عمل بھی غالب ہے۔ طنزومزاح کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں غیر ارادی انشائیہ نگاری کا رجحان بھی ان کے کچھ مضامین میں دیکھنے کو ملتا ہے وہ سماج کی بڑی سے بڑی ناہمواریوں پر سیدھے سادے انداز میں طنز کرتے ہیں مجتبیٰ حسین اپنے وسیع مطالعے عمیق مشاہدے اور تجربے کی مدد سے زندگی کے عدم توازن کے مخفی پہلوؤں کو اجاگر کر کے قاری کو حظ و مسرت بہم پہنچاتے ہیں ان کی تحریروں کو پڑھتے وقت قاری کے ذہن پر کسی طرح کا کوئی بوجھ نہیں محسوس ہوتا ہے۔ طنز کی نشتریت اور مزاح کی آمیزش نے ان کے انشائیوں کو دو آتشہ بنادیا ہے۔ مجتبیٰ حسین خیال کی آوارہ خرامی سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ خیال کی ڈور کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں اور آخر میں اس چابکدستی سے سمیٹتے ہیں کہ قاری کی طبع نازک پر گراں نہیں گذرتا۔ مجتبیٰ حسین کا تخیل آسمانِ لامحدود کی فضاؤں میں بے لگام گھوڑے کی طرح دوڑتا ہے مگر ان کی تحریروں میں وطنی محبت، ہندوستانی معاشرے کی آب و ہوا تمام انشائیوں میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ بعض انشائیے اس قدر دل کش ہیں کہ قاری کی ذات ان کے اندر ضم ہو جاتی ہے۔ اس وقت قاری خود کو اس کا ایک اٹوٹ حصہ تصور کرتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے انشائیوں میں شخصی رنگ جگہ جگہ ملتا ہے۔ مصنف کی شخصیت کے مختلف پہلو انشائیوں کے پس منظر میں جھانکتے نظر آتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کا وصف خاص تحریف سے شگفتگی پیدا کرنا بھی ہے۔ تحریف چونکہ طنزومزاح کی ایک صورت ہے اسلئے

انشائیہ میں عموماً اس حربہ سے کام لیا جاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے۔ بات سے بات نکالتے چلے جانا اور موضوع کے نئے نئے گوشوں کی نقاب کشائی کرنا۔ چنانچہ ان کا ہر انشائیہ قاری پر جہانِ معنی کے نئے نئے دروازے کھولتا ہے ان کے یہاں خالص انشائیہ شاید ہی ملے مگر ان کے کچھ طنزیہ ومزاحیہ مضامین کو ہم انشائیہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ اگر طنزیہ اور مزاحیہ کی خصوصیات کے حامل ہیں تو انشائیہ کی خصوصیات بھی ان میں پائی جاتی ہیں ان کے کچھ ہی انشائیے ایسے ہیں جن میں اسلوب بیان کا غالب رجحان ہے جس کی بناء پر انھیں ہم انشائیہ کہیں گے۔ مثلاً ''قصہ ڈاڑھ کے درد کا'' ہماری بے مکانی دیکھتے جاؤ'' ریلوے منتری مسافر بن گئے۔

اردو میں خالص انشائیہ نگار کی بہت کمی ہے پھر بھی ہم ان کو خالص انشائیہ نگار کہہ سکتے ہیں جنھوں نے ادب کے دوسرے شعبوں میں طبع آزمائی کی اور اپنی شناخت قائم کی مگر ساتھ ہی ساتھ انشائیوں کا مجموعہ بھی شائع ہوا۔ احمد جمال پاشا کے ہم عصروں میں ایسے چار انشائیہ نگار ہیں جن کو ہم خالص انشائیہ نگار کہہ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر جاوید وششٹ، سید ضمیر حسن دہلوی، ڈاکٹر سید محمد حسنین عظیم آبادی اور رام لعل نابھوی احمد جمال پاشا کے ہم عصر خالص انشائیہ نگار ہیں جنھوں نے صرف ایک ایک مجموعہ شائع کرایا۔ ان کا الگ الگ جائزہ لے کر ان کے انشائیوں کی بنیاد پر ان کے فن اور شخصیت کے حوالے سے ان کا سرسری جائزہ پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

ڈاکٹر جاوید وششٹ:

اردو ادب میں یوں تو ادیبوں اور نثر نگاروں کی کمی نہیں ہے مگر خالص انشائیہ نگار کی حیثیت سے صرف چند ہیں جن میں ایک نام ڈاکٹر جاوید وششٹ کا ہے۔ جنہوں نے اردو انشائیہ نگاری میں ''انشائیہ پچیسی'' لکھ کر ایک بیش قیمتی اضافہ کیا ہے۔ ڈاکٹر جاوید وششٹ بطور شاعر، مبصر، نقاد، نثر نگار اور محقق اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے تھے بطور انشائیہ نگار پہلی بار ''انشائیہ پچیسی'' کے منظر عام پر آنے کے بعد انہیں شہرت ملی۔ ڈاکٹر جاوید وششٹ نے اپنی طالب علمی کے دور میں ہی انشائیہ لکھنا شروع کر دیا تھا جس کا اعتراف خود انہوں نے اپنی کتاب کے ابتداء میں کیا ہے۔ انکا پہلا انشائیہ ۱۹۴۰ء کے آس پاس شائع ہوا مگر انشائیہ پچیسی کے تمام انشائیے ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۲ء کے درمیان لکھے گئے۔ صرف ایک انشائیہ'' سو بھی ایک عمر میں ہوا معلوم'' ۱۹۵۴ء میں لکھا گیا بحیثیت استاد درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ ادبی سرگرمیوں میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ہدایت

پر ''سب رس'' کا قصہ ''حسن ودل'' مرتب کیا۔ بطور محقق انہوں نے ملا وجہی کو انشائیہ نگار ثابت کیا ملا وجہی کے انشائیوں کو ایک بصیرت آمیز مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ اردو میں انشائیہ نگاری کی روایت کو ملا وجہی سے جوڑ کر ان کو اردو کا پہلا انشائیہ نگار قرار دیا جبکہ اسی درمیان سید محمد حسنین عظیم آبادی' اختر اورینوی کے حوالے سے علی اکبر قاصد کو اور ڈاکٹر وزیر آغا خود اپنے آپ کو پہلا انشائیہ نگار ثابت کرنے کی پہل کر رہے تھے۔ ان دو انشائیہ کے اسکولوں میں ڈاکٹر جاوید وششٹ نے انشائیہ کے تیسرے اسکول کا اضافہ کیا۔ جاوید وششٹ کی پیش کردہ تجویز کی سبھی نے تردید کی مگر ان کی تحقیقی کوشش اور بصیرت آمیز مقدمہ کا اعتراف سبھی نے کیا ہے۔ اس سے اردو انشائیہ نگاری کی تحقیق وتنقید میں استفادہ کیا گیا۔ ''ملا وجہی کے انشائیے'' کی اشاعت ۱۹۷۲ء میں ہوئی اسکے بعد خود ان کے اندر بھی نثر نگاری کا رجحان پیدا ہوا جس سے انکے ذہن میں انشائیہ نگاری کی شعائیں پھوٹنے لگیں۔ انشائیہ پچیسی کے انشائیے ۱۹۷۰ء سے لکھنے کی شروعات کی جو ۱۹۸۵ء میں کتابی شکل میں منظر عام پر آئے۔

ڈاکٹر جاوید وششٹ ان انشائیہ نگاروں میں سے ایک ہیں جو انشائیہ کے فنی محاسن سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے انشائیہ نگاری کی حدود متعین کی اسکے خدوخال کو واضح کیا۔ خصوصیات کی نشاندہی کی اور مختلف انشائیہ نگاروں کی آراء کو مدنظر رکھتے ہوئے انشائیہ نگاری میں اعتدال سے کام لیا اور انشائیہ کو اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کی جو کافی حد تک ایک اہم کوشش ہے۔ انشائیہ کے فنی محاسن کی نشاندہی ٹھیک ٹھیک کرنے کے باوجود وہ انشائیہ کی تخلیق میں بھٹکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے چند انشائیوں کو چھوڑ کر باقی تمام انشائیوں کی زبان کافی بلیغ' مشکل اور تکلف آمیز ہے جب کہ بے تکلفی انشائیہ کا حسن ہے ان کے انشائیوں کو پڑھنے کیلئے کافی ذہنی ورزش کی ضرورت ہوتی ہے۔ بوجھل پن کا احساس ہوتا ہے بلکہ جابجا اشعار سے نثر کی سلاست کم ہو جاتی ہے۔ بے ربطی کے بدلے میں ان کے انشائیوں میں الفاظ کی سلیقہ مندی اور سنجیدگی جابجا ملتی ہے۔ ان کے انشائیوں کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بغیر ردعمل کے وجود میں آئے ہیں اور انھیں قصداً و ارادتاً نوک قلم تک لانے کی کوشش کی گئی ہے نہ کہ یہ خود بہ خود صفحہ قرطاس پر بکھرے ہیں خود ڈاکٹر جاوید وششٹ انشائیہ پچیسی میں لکھتے ہیں:

> ''انشائیہ کی جملہ خصوصیات مثلاً غیر سنجیدگی' بوقلمونی' رنگا رنگی' کیف انگیزی' گپ بازی' آوارہ خیالی' شگفتہ بیانی' خوش طبعی شوخی' سادگی' برجستگی' بے ربطی اور بے ترتیبی وغیرہ کی علامت اور اشاریہ بننے کی صلاحیت ہے۔'' (۴)

درج بالا اقتباس کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ہم انکے انشائیہ پچپیی کا جائزہ لیتے ہیں تو کئی جگہ ہمیں مایوسی ہوتی ہے جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ انشائیہ کے فنی محاسن سے وہ بخوبی واقف تھے مگر انشائیہ کی تخلیق پر وہ کھرے نہ اتر سکے۔ انشائیہ تخلیق کرنے کا فن پل صراط سے گزرنے کا فن ہے۔ اس کو پار کرنے والا ہی صراط مستقیم تک پہنچتا ہے جاوید وششٹ کئی جگہ پل صراط سے گزرتے ہوئے ڈگمگائے ہیں۔ ملاحظہ ہو اقرار تقصیر سے ایک اقتباس:

> ''دور جاہلیت میں صحرائے عرب سے چند بے قرار بگولے اٹھے جو باد سموم کے دوش پر سوار، عرب فرقوں کی طرح آپس میں دست وگریباں ہوگئے۔ انکے تصادم سے عناصر خمسہ کی مانند پانچ ذرّے۔ ت،ق،ص،ی،ر۔ ظہور ترتیب کے بعد جب عالم امکان میں آئے تو عربی لفظ تقصیر کا روپ دھار چکے تھے۔ اللہ اللہ! ایک سرے پر پنجتن پاک کا مقدس نور تو دوسرے پر تقصیر کی تاریکی۔ ایک طرف اسلام کا اجالا تو دوسری طرف کفر کا اندھیرا۔ لیکن
>
> ؎ کفر کو چاہیے اسلام کی رونق کے لئے
>
> گویا کفر باعثِ رونق اسلام ہے اسی طرح تقصیر باعثِ تزئین اخلاق۔'' (۵)

اس اقتباس کے مطالعے کے بعد شگفتہ بیانی، سادگی، برجستگی، بے ترتیبی اور غیر سنجیدگی جیسی خصوصیات (جو انشائیہ نگاری کیلئے ضروری ہیں) کا ذکر بے محل لگتا ہے۔ غیر سنجیدگی کی کمی کھٹکتی ہے۔ ''تو سوچ ہے بلی اور جج'' سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ہندو فلسفہ چار مقاصد حیات قرار دیتا ہے۔ (۱) ارتھ (معیشت) (۲) کام (جنس) (۳) دھرم (مذہب) (۴) موکش (نجات)۔ جج موکش کا ذریعۂ حصول ہے۔ منو نے بھی حیاتِ انسانی کو چار حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) برہم چریہ آشرم (۲۵ سال تک) (۲) گرہست آشرم (۲۵ سے ۵۰ سال تک) (۳) بان پرست آشرم (۵۰ سے ۷۵ سال تک) (۴) سنیاس آشرم (۷۵ سال سے ۱۰۰ سال تک) جج سنیاس کی علامت ہے۔''...... (۶)

ان اقتباسات سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ جاوید وششٹ انشائیہ نگار تو ہیں مگر ان کے انشائیے انشائیہ نگاری کی میزان پر پورے نہیں اترتے۔ ایک اچھے نثر نگار کی حیثیت سے ان کے اسلوب بیان میں بانکپن ہے انکے یہاں، وہی محبت پرانی قدروں سے لگاؤ، خلوص و یگانیت اور وسیع

مطالعے کا غالب رجحان نظر آتا ہے ان کے انشائیے باتصویر اور علامتی انداز میں چھپے ہوئے ہیں۔ یہ انکی پہلی کوشش ہے جہاں ان کے انشائیوں میں موضوعات کا تنوع اور رنگا رنگی ہے وہیں انکے انشائیوں میں عصری آگہی کی کمی کھٹکتی ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاں ہندوستان میں انشائیہ نگار اور خالص انشائی مجموعوں کی کمی ہے وہیں انشائیہ کی کٹھن ڈگر پر جاوید وششٹ نے چل کر انشائیہ پچپیی کی تخلیق کی جس سے انشائیہ نگاری کی راہیں ہموار ہوئیں اور انشائی ادب میں ایک اضافہ۔ انکے چند انشائیے بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً دھنک، سینگ، ''روزنِ در'' ''لا'' جیم۔ ہے۔ یہ۔ زے'' اور ''کھلونا'' وغیرہ۔

سید محمد حسنین عظیم آبادی:

حسنین عظیم آبادی ہندوستان میں انشائیہ کے میدان میں اسلئے سربلند نظر آتے ہیں کہ انہوں نے سب سے پہلے انشائیہ کا جھنڈا بلند کیا ہے اور اسکی ادبی نوعیت سے بحث کی ہے۔ سید محمد حسنین اردو انشائیہ نگاری میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو انشائیہ نگاری کی بحث کے ایک فریق یہ بھی تھے۔ وزیر آغا بنام سید محمد حسنین ایک ایسی بحث چلی جس نے اردو انشائیہ نگاری کا دامن مختلف مضامین نئے نئے انشائیہ اور انشائیہ نگاروں سے بھر دیا۔ سید محمد حسنین اردو ادب میں تقریباً ۱۹۴۰ء کے آس پاس بطور افسانہ نگار داخل ہوئے مگر وہ بعد میں نثر کی دوسری اصناف میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ تنقید و تحقیق کی طرف جھکاؤ تھا اسلئے تنقید ہی کو چن لیا اور تحقیق و تنقیدی مضامین ومقالے لکھنے لگے۔ ۱۹۵۸ء میں اردو انشائیہ کے فن پر انکی پہلی باضابطہ کتاب ''صنف انشائیہ اور انشائیے'' منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں انشائیہ کی صنف سے انہوں نے پہلی بار تفصیلی بحث کی اور بتایا کہ انشائیہ، مضمون سے الگ ایک صنف ہے۔ اسکی حدود مضمون نگاری، خاکہ نگاری، مقالہ نگاری، سوانح نگاری، طنز و مزاح نگاری کی حدود سے ملتی ہے مگر یہ ان سب سے جدا ایک صنف ہے۔ انشائیہ کو ذہن کی آزاد ترنگ اور ادبی پھلجھڑی قرار دیا۔ انشائیہ کو صنفی حیثیت دلانے میں انکا بھرپور تعاون رہا۔ اختر اورینوی نے اردو انشائیہ کی نامزدگی کی اور سید محمد حسنین نے انکی تقلید کی ان کی روایت کو آگے بڑھایا۔ علی اکبر قاصد کو پہلا انشائیہ نگار اور ''ترنگ'' کو پہلا انشائیوں کا مجموعہ قرار دیا۔ جس سے وزیر آغا نے انکار کیا۔ خود کو پہلا انشائیہ نگار اور اپنے انشائیوں کے مجموعے ''خیال پارے'' کو پہلا مجموعہ قرار دے دیا۔ وزیر آغا نے اپنا ایک گروپ بنا لیا جو انشائیہ کی حمایت میں وزیر آغا کی

اندھی تقلید کرنے لگا بعد میں وزیر آغا نے اس بات کا اعتراف کیا کہ پہلی بار لفظ انشائیہ کا استعمال اختر اورینوی نے کیا مگر وہ انشائیہ کی تحریک نہ چلا سکے اس لئے ازسرِ نو تحریک چلا کر وزیر آغا پہلے انشائیہ نگار بن بیٹھے۔ اردو انشائیہ نگاری کی تنقید کے سلسلے میں اس طویل بحث سے سید محمد حسنین نے استفادہ کیا اور انشائیہ کے تمام خدوخال کو اچھی طرح سمجھ کر بغور مطالعہ کر کے بذاتِ خود انشائیہ نگاری حیثیت سے بھی ابھرے۔ انشائیہ سے دل چسپی صرف افہام و تفہیم یا درس تدریس، تحقیق و تنقید تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ عملی طور پر انشائیہ کی تخلیق میں دلچسپی لینے لگے اور اس غیر سنجیدہ صنفِ ادب پر سنجیدگی سے غور کرنے لگے۔ بحیثیت انشائیہ نگار جائزہ لینے پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ اردو ادب کے خالص انشائیہ نگار کی ایک کڑی ہیں۔ ان کے مضامین و انشائیے ہندو پاک کے ادبی جریدوں میں برابر شائع ہوتے رہے۔ انشائیوں کا مجموعہ ''نشاطِ خاطر'' ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ جس میں گیارہ انشائیے۔ پیش لفظ، سخن اور بقلم خود و بقلم مظفر شامل ہیں۔ محمد حسنین انسانی زندگی سے چھوٹے چھوٹے موضوعات کو منتخب کر کے انشائیہ تخلیق کرتے ہیں جس کے بارے میں کلیم الدین احمد نے پیش لفظ میں لکھا ہے:

> ''اچھی نثر ہر نثر نگار کے بس کی بات نہیں۔ ڈاکٹر محمد حسنین کے یہ انشائیے اچھی نثر کے نمونے ہیں۔ ان تحریروں میں ان کی فکر بھی شامل ہے۔ جس میں تازگی ہے اور دل آویزی بھی اور وہ بے تکلفانہ انداز میں کچھ سناتے بھی ہیں یہ بڑی بات ہے۔''(۷)

محمد حسنین نے ہندوستان میں خالص انشائیہ نگاری کی شروعات کی ''نشاطِ خاطر'' کے انشائیوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ محمد حسنین نے ان انشائیوں کو قصداً یا ارادتاً نہیں لکھا نہ ہی ان سے قہراً جبراً لکھوائے گئے ہیں۔ بلکہ فنِ انشائیہ پر مہارت اور نثری شغف ہونے کے سبب یہ وجود میں آئے۔ ان میں ان کا اسلوبِ بیان ایسا ہے جیسے کوئی عام انسان گفتگو کرتا ہے۔ بے تکلفانہ اندازِ بیان مرکزی خیال سے جڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے موضوعات کو بھی شامل کرتے ہیں مگر اپنے اصل موضوع یا مرکزی خیال سے بھٹکتے نہیں ہیں۔ ان کے اسلوبِ بیان میں سادگی ہے اگر ہم اسے شاعرانہ انداز میں کہیں تو ان کی نثر میں ''آمد'' جیسی کیفیت ہے۔ ان میں منتشر خیالی بھی ہے اور ذہنی سطح پر ایک ربط و تسلسل بھی۔ جسے خود انہوں نے وحشی اور سرکش خیالات کی قلم بندی بتایا ہے۔ بے ربطی کے باوجود اس میں ادبیت ہے ان میں منتشر تاروں کی جوت اور جنگلی پھولوں کی خوشبو ہے۔ ''مزاج اور رواج'' میں خالص انشائیہ کی فضا شروع سے آخر تک برقرار ہے۔ اس میں

موضوعات کا تنوع ہے۔ جیسا مزاج ہوتا ہے ویسا رواج ہوتا ہے اور رواج خود مزاج بنا دیتا ہے۔ آپ عاشق ہوں، دودھ میں پانی ملاتے ہوں، شعر کہتے ہوں، شعر و ادب کی محفلیں سجاتے ہوں، دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوں، ہر حال میں نہ آپ رواج سے بچ سکتے ہیں اور نہ مزاج سے۔ انہیں باتوں کو بڑے ہی لطیف انداز میں انشائی رنگ دیکر اپنے انشائیے میں پیش کیا ہے ملاحظہ ہو ایک دو جملے:

> ''دودھ میں پانی ملانا رواج تھا۔ پانی میں دودھ ملانا اب عام رواج ہے۔''(۸)
>
> ''رنگِ تغزل اردو شاعر کا مزاج ہے اور شرف تلمذ شعراء کا رواج''(۸)
>
> ''بادِ مخالف میں چلنا اور چلتے بھی جانا اپنے دیدے پھوڑنا اور دوسروں کی آنکھ میں دھول جھونکنا ہے''(۹)

یہ دل چسپ جملے، یہ بولتے ہوئے فقرے، یہ پھڑکتے ہوئے قولِ محال اور زعفرانِ زار بیانات سے مصنف کی قلم آرائی کے جوہر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کے خیالات میں شگفتگی اور فکر میں تازگی ہے وہ حساس اور دردمند ہیں ان کے زیادہ تر فقرے چست، شاداب اور تر و تازہ خیالات کے انشائی رنگ میں ڈوبے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مزاج اور رواج میں انکا موضوع تہذیب اور معاشرت ہے۔ ''مچھر'' زندگی پر عنوان کی رعایت سے دلچسپ انداز میں تبصرہ ہے۔ تخیل اور مشاہدے کی مدد سے فکر و خیال کی چکا چوند پیدا کر دی ہے۔ ''تقویٰ'' میں مذہب، اخلاق اور پرہیز گاری کے تعلق سے قلم کار کا خاکہ بڑے لطیف انداز سے پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کے تمام انشائیوں میں خیال کی بے ربطی موضوعات کی رنگارنگی، زبان و بیان کی چابکدستی، اختصار و بانکپن، دعوتِ فکر انکشافِ ذات یا شخصی ردِ عمل، وسیع مطالعے اور عمیق مشاہدے کا احساس ہوتا ہے۔ ''نشاطِ خاطر'' کے انشائیوں میں موضوعات کا تنوع ہے جو قلم کار کے نظر و شعور کی نیرنگی کا ثبوت ہیں مثلاً آداب و ادیب، ہیئت اور حلیہ'' مطالعہ اور مشاہدہ، بدنامی اور ہیرو'' وغیرہ کے رنگارنگ موضوعات جس میں اسلوب کی کشش ہمیں دعوتِ فکر دیتی ہے اور موضوعات کی تہہ داری مختلف پرتو کو اتار کر موضوع کے مخفی مفاہیم سے آشنا کراتے ہیں جس سے قاری کی توجہ مرکوز ہو جاتی ہے اور قاری پر ان کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے جس میں ڈوبنے کے بعد قاری کو ایسا لگتا ہے جیسے اسے کچھ حاصل ہو گیا ہے۔ ان کے مشاہدے کی بوقلمونی اور انکے تجربات کی وسعت کی شہادت ان کے انشائیے دیتے ہیں۔ انشائیہ نگار خود مختار اور آزاد خیال

ہوتا ہے وہ لفظوں کی جادوگری سے خشک موضوعات اور سنجیدہ سے سنجیدہ بات کو اس طرح بے باکانہ انداز میں بے ساختگی سے بیان کرتا ہے کہ قاری کو مسرّت حاصل ہوتی ہے مثلاً استاذ'' آداب اور ادیب'' اور '' تقویٰ'' وغیرہ حسنین عظیم آبادی کے اچھوتے موضوعات ہیں یہ پامال موضوعات پر خامہ فرسائی نہیں کرتے اسلئے انکے یہاں ندرت اور جدّت ہے یہ اپنا مواد علم وادب یا ادب وتہذیب اور معاشرت سے حاصل کرتے ہیں ان کے انشائیوں میں شوخی' خیالات کی بے ربطی اور موج دل نشیں کی کیفیت ہے جس میں انہوں نے اپنا رنگ و آہنگ اسلوب و انداز پیدا کر لیا ہے جو صاحب طرز انشائیہ نگار کا خاصہ ہے۔

رام لعل نابھوی

رام لعل نابھوی نے اپنے ادبی سفر کی شروعات نثر سے کی ان کے دو نثری مجموعے منظر عام پر آئے ''تبسم'' ان کا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا جسے خود رام لعل نابھوی نے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ قرار دیا ہے مگر غیر ارادی طور پر ''تبسم'' کے کچھ مضامین بھی انشائیہ کے زمرے میں شامل ہیں مثلاً اعداد سے ملاقات'' اور نیا پن'' موضوعات کی رنگا رنگی خیال کی بے ربطی' اسلوب بیان کی شگفتگی' اختصار' عدم تکمیل یا غیر سالمیت اور دعوتِ فکر وغیرہ خصوصیات کا مجموعہ ہیں جن کی بنیاد پر ہم انہیں انشائیہ تسلیم کر سکتے ہیں۔

ان میں طنز و مزاح بھی ہے مگر آٹے میں نمک کے برابر جس سے انکی شگفتگی میں اور نکھار آتا ہے۔ اسلوب بیان اور طرز تحریر کا غالب رجحان ان میں پایا جاتا ہے جس کی بنیاد پر ہم ان کو انشائیہ کہیں گے۔ رام لعل نابھوی بہ یک وقت مضمون نگار، مقالہ نگار، طنز و مزاح نگار، تنقید نگار، مبصر اور انشائیہ نگار ہیں لیکن طنز و مزاح نگار اور انشائیہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اردو انشائیہ نگاروں میں خالص انشائیہ نگاروں کی کمی کھٹکتی ہے جہاں دوسری اصناف میں لاتعداد ادیب و فنکار ہیں وہیں انشائیہ میں بالخصوص ہندوستان میں صرف چند انشائیہ نگار ہیں۔ رام لعل نابھوی نے بھی محمد حسنین اور جاوید وششٹ کی طرح پہلے انشائیہ کے فن سے بحث کی اور'' انشائیہ کیا ہے'' کو سمجھا۔ انشائیہ کے فن پر ایک طویل مضمون بھی اپنے مجموعہ'' آم کے آم'' میں شامل کیا جس میں انہوں نے انشائیہ کے فن' انشائیہ کی اصطلاح' انشائیہ کے آغاز و ارتقاء مغرب کے انشائیہ نگاروں کے خیالات' حوالجات' تحریروں سے اقتباسات کو پیش کیا۔ پھر اس کے برعکس مشرقی انشائیہ سے بحث کی

اور مشرقی انشائیہ نگاروں کے حوالے اور اقتباسات کو پیش کیا ہے مگر اس میں انہوں نے اپنی تقلید کی جانبداری سے کام لیا ہے اور خالص انشائیوں کے اقتباس میں تمام یا بیشتر اقتباسات پاکستان کے انشائیہ نگاروں کے پیش کئے ہیں۔ رام لعل نابھوی بھی اندھی تقلید کرتے ہیں جبکہ انکی طرز تحریر اور اسلوب بیان میں وہ جولانیاں ہیں جس کا اعتراف انشائیہ کی تنقید میں بغیر جانبداری کے بھی ہو سکتا ہے مگر اوراق گروپ سے وہ اپنے انشائیہ کی تصدیق کرانے کے خواہش مند معلوم ہوتے ہیں تاکہ انشائیہ نگاری کی سند مل جائے۔ انشائیہ میں اختلاف کے پہلو کو بڑی حسن و خوبی سے بیان کیا اور اعتدال کی راہ اپنائی ہے۔

'' آم کے آم'' ۱۹۸۳ء میں منظر عام پر آیا جس میں اٹھارہ انشائیے شامل ہیں۔ آم کے آم کی ابتداء میں انشائیہ کی تعریف و تاریخ بیان کرتے ہوئے ایک انگریز نقاد کے حوالے سے رام لعل نابھوی نے لکھا ہے:

> '' ایسے کی یہی خصوصیات یعنی اختصار' تحریر کی غیر سالمیت' بیان میں سادگی' بے تکلفانہ پن اور شخصی ہونا کم وبیش اردو انشائیے کی بنیادی خصوصیات ہیں۔'' (۱۰)

دوسرے تمام انشائیہ نگاروں میں رام لعل نابھوی کو خالص انشائیہ نگار اسلئے بھی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے انشائیہ کے فن سے استفادہ کیا اور انشائیہ تخلیق کرتے وقت انشائیہ کی خصوصیات کو مدنظر رکھا جس سے ان کے انشائیے ملاوٹ سے عاری ہیں نابھوی کا سب سے اہم حربہ اسلوب یا طرز بیان ہے جو کہ ایک انشائیہ نگار کے لئے ضروری بھی ہے۔ ان کے طرز بیان یا طرز تحریر کی سب سے نمایاں خصوصیات سادہ، بے تکلف اور رواں دواں بلکہ ایک حد تک مترنم انداز بیان ہے۔ ابھرے اور گہرے، سادہ اور پیچیدہ، عام فہم اور بلند پایہ خیالات کا ایک طویل سلسلہ الفاظ کے بہاؤ میں آہستہ آہستہ اس طرح شامل ہو جاتا ہے کہ کسی رکاوٹ' بوجھل پن' اکتاہٹ یا الجھن کا احساس تک نہیں ہوتا اسی بے تکلف انداز بیان اور پر کیف لطافت سے شگفتگی جنم لیتی ہے جو ایک انشائیہ میں روح کی حیثیت رکھتی ہے اور رگوں میں لہو بن کر دوڑتی ہے۔ الفاظ کی تکرار' اشاروں اور کنایوں کے اقوال' قول محال اور رعایت لفظی کے سہارے رام لعل نابھوی ایک ایسی صورت پیدا کر دیتے ہیں جس میں شگفتگی ہے۔ نزاکت ہے جس سے قاری کو حظ حاصل ہوتا ہے اور ایسی شگفتگی مسرت بہم پہنچانے کیلئے وسیلہ کا کام کرتی ہے۔ یہ کیفیت قاری کو اپنے اندر پوری طرح جذب کر لیتی ہے۔ الفاظ

کی رنگینی اور لفاظی یا لفظی جادوگری کی گرفت سے قاری اس وقت نجات پاتا ہے جب اچانک انشائیہ ختم ہو جاتا ہے۔ رام لعل نابھوی کے تقریباً سبھی انشائیے اچانک ختم ہو جاتے ہیں جس سے قاری کو تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ مگر انشائیہ کی ایک اہم خصوصیت عدم تکمیل، غیر سالمیت یا تشنگی ہے جس کو اپنے ہر انشائیے میں رام لعل نابھوی نے بہ حسن وخوبی روا رکھا ہے۔ قاری کو جب عدم تکمیل یا تشنگی کا احساس ہوتا ہے تو فوراً ہی اسکے ذہن میں انشائیہ کی بدولت مختلف سوالات ابھرنے لگتے ہیں جس سے قاری کسی سوچ میں گم ہو جاتا ہے اور ایک لمحہ کیلئے اس پر سکوت طاری ہو جاتا ہے جسے ہم دعوت فکر کہہ سکتے ہیں۔ انشائیہ کی ایک خصوصیت دعوتِ فکر دینا بھی ہے۔ جو رام لعل نابھوی کے انشائیوں میں موجود ہے۔

رام لعل نابھوی موضوعات کے انتخاب میں کافی غور و فکر اور سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتے ہیں ان کے انشائیوں کے موضوعات غیر مرئی اشیاء اور جذبات وکیفیات ہیں جن کو وہ شخصیت عطا کرتے ہیں انھوں نے مجرّد کو مجسم بنا کر پیش کیا ہے بالخصوص ''انتظار''، فیشن، مسئلہ، تنہائی'' وغیرہ کو انہوں نے بڑے فن کارانہ انداز میں مجسم کیا ہے ان کے یہاں اکہری مزاحیہ تحریریں نہیں ملتی بلکہ وہ لفظوں سے مزاج پیدا کرتے ہیں۔ وہ مسکرانے کے لئے لطیفے یا شعر بیان نہیں کرتے بلکہ زندگی کے تضادات اور ناہمواریوں کی تلاش اور نشاندہی خود بخود مسکراہٹ کو جنم دیتی ہے۔ اسلئے ان کی تحریریں تبسم زیرلب کے ساتھ ساتھ دعوتِ غور و فکر بھی دیتی ہے ان کے انشائیوں میں عصری آگہی بھی ہے اور شخصی ردّعمل بھی غیر سالمیت بھی ہے۔ بیان میں سادگی، شگفتگی اور لطافت بھی ہے۔ بے تکلفانہ پن اور غیر منطقی ربط بھی ہے۔ منتشر خیالی بھی ہے اور آزاد خیالی بھی موضوعات کا تنوع بھی ہے اختصار بھی ہے یعنی رام لعل نابھوی کے انشائیے انشائیہ کی تعریف پر صد فیصدی پورے اترتے ہیں اور اسطرح اردو میں انشائیہ نگاری کا بہترین نمونہ پیش کرنے میں رام لعل نابھوی کامیاب نظر آتے ہیں۔

سید ضمیر حسن دہلوی:

سید ضمیر حسن دہلوی کا نام بھی خالص انشائیہ نگاروں میں لیا جاتا ہے انہوں نے انشائیوں میں فنی نزاکتوں کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ موضوعات کے انتخاب میں گرد و پیش کے ماحول کا سہارا لیا ہے چھوٹے چھوٹے جملوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنے انشائیوں کا موضوع بناتے ہیں جس سے موضوع کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ عام طور پر ہم سماج کی بدعنوانی سے روزانہ دوچار ہوتے ہیں ان

سے میرا براہ راست یا بالواسطہ سابقہ پڑتا ہے مگر ہم ان کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ضمیر دہلوی بحیثیت انشائیہ نگار ان کو انشائیہ کا موضوع بنا کر عام قاری کو اس کے مبہم پہلو سے آشنا کراتے ہے۔ ''گالیاں'' ان کا اس طرح کا انشائیہ ہے جس میں غیر منطقی ربط بھی ہے، بے ربطی بھی ہے شخصی ردّعمل بھی ہے۔ زبان و بیان میں بانکپن اور اسلوب میں سادگی، حقیقت کا اظہار وغیرہ ان کے انشائیوں کی اہم خوبیاں ہیں جس کی بنیاد پر ہم انہیں خالص انشائیہ نگار کے زمرے میں شامل کرتے ہیں۔ دہلی کی روزمرہ کی زبان ضمیر دہلوی کی تحریر کی جان ہے۔

آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کے احمد جمال پاشا کے معاصرین کی فہرست طویل ہے ان کے کبھی ہمعصروں کے یہاں کچھ خالص انشائیے ضرور ملتے ہیں جیسے احمد جمال پاشا کے یہاں۔ پاشا بھی خالص انشائیہ نگار نہ تھے مگر جب انشائیہ لکھتے تو تمام فنی نزاکتوں اور عصری تقاضوں کو اپنے انشائیہ میں منعکس کر دیتے اسلئے ہمعصروں میں احمد جمال پاشا ایک منفرد حیثیت کے مالک رہے انہوں نے ہر دور کے غالب رجحان کی پیروی کی اور کبھی بھی تیز آندھی یا ہوا کے جھونکوں کے مخالف نہیں رہے بلکہ ہمیشہ وہ ''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی'' کی پیروی کرتے رہے جس نے انہیں بلندی پر پہنچایا اور ان کے فن کو قابلِ قبول بنایا۔

☆☆☆☆☆

حواشی

۱	مضامین پطرس۔ پطرس بخاری، ادبی دنیا، دہلی ۱۹۷۳ء	۲۸
۲	نیا دور، لکھنؤ، مارچ تا ستمبر ۱۹۸۸ء	۱۷۳
۳	نیا دور، لکھنؤ، مارچ تا ستمبر ۱۹۸۸ء	۱۷۳
۴	انشائیہ پچیسی، ڈاکٹر جاوید وششٹ، سلوجہ پرکاشن، دہلی ۱۹۸۵ء	۱۷
۵	انشائیہ پچیسی، ڈاکٹر جاوید وششٹ، سلوجہ پرکاشن، دہلی ۱۹۸۵ء	۲۱
۶	انشائیہ پچیسی، ڈاکٹر جاوید وششٹ، سلوجہ پرکاشن، دہلی ۱۹۸۵ء	۱۲۳
۷	نشاط خاطر، ڈاکٹر سید محمد حسنین، دائرہ اردو، گیا ۱۹۸۰ء	۹
۸	نشاط خاطر، ڈاکٹر سید محمد حسنین، دائرہ اردو، گیا ۱۹۸۰ء	۳۲
۹	نشاط خاطر، ڈاکٹر سید محمد حسنین، دائرہ اردو، گیا ۱۹۸۰ء	۳۹
۱۰	آم کے آم، رام لعل نابھوی۔ از خود، نابھہ ۱۹۸۶ء	۱۷

چوتھا باب

احمد جمال پاشا کی انشائیہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ

احمد جمال پاشا کی انشائیہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ

تقسیم ہند کے بعد اردو میں طنز و مزاح کا ذکر جہاں کہیں بھی ہوا احمد جمال پاشا کا نام اس میں ضرور شامل کیا گیا۔ احمد جمال پاشا اردو ادب میں بہ حیثیت طنز و مزاح نگار جانے جاتے ہیں۔ ان کے ادبی سفر کی شروعات ۱۹۵۰ء میں لکھنؤ سے ہوئی جو وقت اور حالات کے موافق لکھنؤ سے علی گڑھ، علی گڑھ سے لکھنؤ، اور لکھنؤ سے سیوان (پاشا کی سسرال، جہاں وہ لکھنؤ سے منتقل ہوئے اور تا حیات اقامت گزیں رہے) تک جاری رہا، انھوں نے اپنے ادبی سفر کی ابتداء طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھ کر کی اور گاہے بہ گاہے زبان کا مزہ بدلنے کے لئے کبھی وہ بچوں کے ادیب بن جاتے تو کبھی تنقید نگار کبھی سنجیدہ مضامین لکھنے لگتے۔ یعنی احمد جمال پاشا تہہ دار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایسے نثر نگار تھے جن کو غیر افسانوی نثر میں مہارت حاصل تھی۔ ادبی سفر کے آغاز میں طنز و مزاح کا جامہ زیب تن کیا تو مرتے دم تک کبھی نہ اتارا بلکہ کبھی کبھی اس لباس پر وہ کوئی دوسرا لباس زیب تن کر لیتے مگر یہ ان کی مستقل پوشاک نہ تھی۔ ان کے اسلوب میں طنز کا غالب رنگ ملتا ہے زندگی کی آخری دہائی میں انھوں نے وقت اور حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کبھی طنز و مزاح کی شاہراہ کا سفر کیا تو کبھی پگڈنڈی پر چل نکلے۔ یہ پگڈنڈی ہی ان کی انشائیہ نگاری ہے۔ طنز و مزاح اور احمد جمال پاشا ایک دوسرے کے لازم و ملزوم بن چکے تھے مگر جب اردو انشائیہ بحث کا موضوع بنا ہوا تھا تو انھوں نے بھی انشائیہ کی طرف ارادی طور پر رجوع کیا اور فن انشائیہ کا بغور مطالعہ کیا بذریعہ مضمون وہ انشائیہ کی بحث میں شریک ہوئے اور بعد میں وہ باضابطہ طور پر خود انشائیہ لکھنے لگے۔ انکے انشائیوں کا کوئی مجموعہ منظر عام پر نہیں آ سکا۔ جس سے متن اور مواد کی فراہمی ایک مکمل مسئلہ بن گئی۔ جس کی وجہ

سے دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ قیاس ہے کہ انشائے جمال میں غالباً انھوں نے اردو انشائیہ نگاری کے فن سے بحث کی اور اپنے انشائیوں کا انتخاب مرتب کیا۔

مگر پاشا کی اچانک موت کی وجہ سے انکی یہ تخلیق منظر عام پر نہ آسکی۔ ارادتاً جو انشائیے پاشا نے لکھے وہ ہندوستان و پاکستان کے متعدد رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ مثلاً چیخنا'' کچھ تنقید کے بارے میں'' بور'' ہجرت بے ترتیبی'' شور'' اصولوں کی مخالفت میں'' چغلی کھانا'''' تنہائی کی حمایت میں'' اور'' کچھ بلیوں کے سلسلے میں'' وغیرہ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ کچھ ایسے مضامین بھی ملتے ہیں جو مضمون کے زمرے میں شامل ہیں لیکن وہ انشائیہ سے بہت قریب ہیں ان میں انشائیہ کی خصوصیات غالب ہیں۔ انہیں بھی انشائیہ میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ لفظ انشائیہ کی شروعات اختر اورینوی نے کی۔ بعد ازاں ڈاکٹر سید محمد حسنین اور ڈاکٹر وزیر آغا و دیگر حضرات کی بحثوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پاشا جیسا حساس ادیب اس بحث سے بے گانہ ہو یہ بات قابلِ اعتبار نہیں جس دور میں یہ بحث چل رہی تھی وہی دور احمد جمال پاشا کی شوخیٔ تحریر کا بہترین دور ہے۔ اسلئے انکی تحریر میں انشائیہ کی فنی خصوصیات لاشعوری طور پر داخل ہوتی چلی گئی اور نتیجتاً جو تحریر وجود میں آئی وہ مضمون نہیں بلکہ انشائیہ کے قریب ہے مثال کے طور پر میں ایسے چند مضامین کے نام پیش کر رہا ہوں جنھیں پاشا نے مضامین کے زمرے میں رکھا ہے مگر وہ انشائیہ کے قریب ہیں مثلاً'' نیا پیسہ'' مونچھیں'' ٹائم ٹیبل'''' آنی جانی قیامت'' ناپسندیدہ لوگ'' اور'' چند لمحے آل پن کے ساتھ'' وغیرہ مضامین جس دور میں پاشا کے متعدد مجموعوں میں شامل ہوئے اس وقت تک پاشا کے انشائیوں کا کوئی بھی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا اور نہ تا حال ان کے انشائیوں کا کوئی مجموعہ شائع ہوسکا۔ اسلئے طنزیہ مزاحیہ مضامین کے ساتھ انشائیوں کو بھی مجموعے میں شامل کر کے شائع کرایا۔ طنز و مزاح کے مرد میداں ہوتے ہوئے بھی پاشا انشائیہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ کاظم علی خاں اپنے ایک مضمون'' یادِ طرح دار احمد جمال پاشا'' میں لکھتے ہیں:

> ''۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۷ء تک ۳۷ رسال کی مدت میں جمال کی تیز رفتار قلم نے اردو ادب کو جن انبار در انبار فن پاروں سے مالا مال کیا انکی طویل فہرست کا احاطہ کرنے کے لئے کئی صفحات درکار ہونگے۔ انہوں نے مزاح نگاری، خاکہ نگاری، تحریف نگاری، انشائیہ نگاری اور تنقید نگاری کے دوش بدوش تحقیق کے دشوار گزار خارزار میں کامیابی کیساتھ گام فرسائی کر کے دو درجن سے زائد کتابیں مکمل

> کر کے ایک دوست کو اشاعت کے لئے دی تھیں'' (۱)

طنز و مزاح سے مراجعت کر کے انشائیہ میں ارادی طور پر جو ادیب آئے ان میں احمد جمال پاشا کا نام سرفہرست لکھا جاتا ہے۔ اردو انشائیہ کے خیر خواہ ڈاکٹر وزیر آغا جو خود کو انشائیہ کی اتھارٹی مانتے ہیں چند حضرات کو ہی اردو میں انشائیہ نگار تسلیم کرتے ہیں جبکہ انہیں ہندوستان میں نہ تو کوئی انشائیہ نگار نظر آتا ہے اور نہ ہی کوئی ایسی تحریر جس کو وہ مکمل انشائیہ کہہ سکیں وہ اپنی کتاب'' انشائیہ کے خدوخال'' میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں:

> نوجوان لکھنے والوں کے علاوہ بہت سے منجھے ہوئے ادیب بھی انشائیہ نگاری کی طرف راغب ہوگئے چنانچہ کامل القادری شمیم ترمذی اور راغب شکیب کے علاوہ بہت سے سینئر ادباء مثلاً جوگندر پال' احمد جمال پاشا......... بھی انشائیہ نگاری کی طرف راغب ہوئے اور مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کے وہ انشائیے کو طنزیہ و مزاحیہ مضامین نیز دیگر معلوماتی مضامین سے ایک بالکل الگ صنف قرار دیتے تھے۔'' (۲)

دوسروں نے جہاں پاشا کو انشائیہ نگار تسلیم کیا وہیں خود بھی احمد جمال پاشا نے اپنے مضمون'' انشائیہ کی اصطلاح'' میں اس بات کی تصدیق کردی ہے کہ وہ مضمون نگار بھی ہیں تنقید نگار بھی ہیں۔ انشائیہ نگار کے ذیل میں ان کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> '' پھر انشائیہ نگار پیدا ہوتے گئے۔ کارواں بنتا گیا' بڑھتا گیا...... اب تک انشائیہ نگاروں میں ڈاکٹر وزیر آغا' ڈاکٹر داؤد رہبر' مشتاق قمر' غلام جیلانی اصغر' انور سدید سلیم آغا قزلباش، جمیل آزر، احمد جمال پاشا' کامل القادری' رام لعل نابھوی، اسلم عظیم آبادی انجم انصار، طارق جامی، راحت بھٹی، رخسانہ صولت، رب نواز مائل، محمود شام، زہرہ جبیں، اور کے ایم، اشرف، وغیرہ'' (۳)

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ احمد جمال پاشا انشائیہ نگار کی حیثیت سے بھی جانے جاتے تھے۔ احمد جمال پاشا کے انشائیوں کا اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو ہمیں ان میں انشائیہ کی وہ سبھی خصوصیات ملتی ہیں جو کسی انشائیہ کو معیاری اور اعلیٰ بنانے کیلئے ضروری ہیں۔ انشائیہ نگار کو اس کارزار اور لامحدود دنیا کا ہر ذرہ دیوتا دکھائی دیتا ہے۔ احمد جمال پاشا بھی اپنے انشائیوں میں ایسے ہی چھوٹے چھوٹے واقعات تجربات اور محسوسات کو جگہ دیتے ہیں۔ جو عام طور سے روز مرہ کی زندگی

میں ہماری نظروں کے سامنے سے گزرتی ہیں مگر ایک عام آدمی اتنا حساس نہیں ہوتا جتنا کہ ایک انشائیہ نگار۔ انشائیہ نگار انہیں ذروں سے پہاڑ بنا ڈالتا ہے مگر اس میں غلو نہیں ہوتا بلکہ یہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ جسے الفاظ کی بازیگری کہتے ہیں۔ انشائیہ نگار کا سارا دارومدار اسلوب بیان پر ہوتا ہے جیسا اسلوب بیان ہوگا ویسا ہی انشائیہ ہوگا۔ اسلوب بیان انشائیہ نگار کے وسیع مطالعے کی دلیل ہے۔ انشائیہ نگار کا مطالعہ وسیع' مشاہدہ و تجربہ لامحدود ہو اور وہ زندگی کے نشیب وفراز سے اچھی طرح واقف ہو تو اس سے انشائیہ میں انوکھا پن اور اسلوب میں فطری پن پیدا ہوگا۔ انشائیہ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں شگفتگی ہو تکرار نہ ہو۔ اسلئے شگفتگی کیلئے الفاظ کی سلیقہ مندی اور اس کا برمحل استعمال ضروری ہے۔ تکرار سے مراد موضوع کا انتخاب ہے وہ تمام چیزیں جن سے عام زندگی میں روزانہ سابقہ پڑتا ہے انشائیہ نگار انہیں چیزوں سے اپنے انشائیہ کے لئے موضوع منتخب کرتا ہے اور وہ انہیں روزمرہ کی چیزوں کو الٹ پلٹ کر ان کے مخفی مفاہیم کو منظر عام پر لاتا ہے اور قاری کو سرور و انبساط بخشتا ہے۔ یہی انشائیہ کا انوکھا پن ہے جو انشائیہ نگار کی دسترس پر ہے جس کی بنیاد پر انشائیہ کا معیار متعین کیا جاتا ہے اگر انشائیہ میں انوکھا پن نہ ہو تو وہ تحریریں آنکھوں دیکھا حال یا حالات حاضرہ کا جائزہ یا حقیقت پر مبنی رپورٹ بن کر رہ جائے گی۔ خواہ اس روزمرّہ کی چیزوں کو ایک نیا رنگ دینے کیلئے اسکو اپنی جگہ بدلنی پڑے یا ادھر اُدھر سے الٹ پلٹ کرا سکے کسی مخفی پہلو پر روشنی ڈال کر اس کا دوسرا رخ منظر عام پر لائے یعنی کسی بھی شئے کو ایک نیا ڈائمنشن دے۔ پاشا نے بھی مختلف چیزوں پر اس طرح کے تجربے کئے ہیں انہوں نے جس چیز کو اپنا موضوع بنالیا اس کو اصل معنوں میں استعمال کیا مگر ڈائمنشن میں تبدیلی کردی اس کو ایک نئے انداز سے دیکھنے کی کوشش کی جس سے اسکی وسعتوں کا اندازہ لگایا جاسکے۔ قیاس پر بھی وہ لفظی الٹ پھیر سے ایسا بیان کرتے ہیں کہ قاری کے ذہن میں اس کا ایک نیا گوشہ منور ہو جاتا ہے۔ مونچھیں پاشا کا ایک ایسا ہی انشائیہ ہے جس میں پاشا نے مونچھوں کو نئے نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یوں تو مونچھ ایک ایسی ادنیٰ اور حقیری شئے کا نام ہے جس پر عام آدمی کا ذہن نہیں جاتا مگر وہیں ایک انشائیہ نگار جب آتے جاتے مونچھوں کو دیکھتا ہے تو اس میں اس کو بہت کچھ نظر آتا ہے اور وہ اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر اسے ایک نئی صورت عطا کر دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو ایک اقتباس جس میں پاشا نے مونچھوں کی قسمیں کس کس انداز میں گنوائی ہیں اور صرف چند بالوں کو کس سلیقہ سے سجا کر نئے نئے ڈائمنشن عطا کئے ہے:

موسم' لباس اور فیشن کی طرح مونچھوں کے اسٹائل بھی برابر بدلتے رہتے

ہیں اگر ان رنگا رنگ مونچھوں پر آپ راہ چلتے ایک نظر بھی ڈالیں تو آپ کو انواع واقسام کی مونچھیں' نظر آئیں گی مثلاً او دبلاؤ مارکہ مونچھیں' شعلے اڑاتی ہوئی مونچھیں، ناگن کی طرح بل کھائی اور سانپ کی طرح پھن اٹھائے ہوئے مونچھیں' بچھو کے ڈنک کی طرح اڑینگی مونچھیں، مکھی کٹ مونچھیں، مسور دکھنے والی مونچھیں، تلوار مارکہ مونچھیں، کٹار مارکہ مونچھیں، جھاڑو نما مونچھیں' پونچھ نما مونچھیں، بارہ، دو دس سوا نو' آٹھ، بیس اور ساڑھے چھ بجاتی مونچھیں، اور خرگوشیہ مونچھیں وغیرہ۔ (۴)

انشائیہ تخلیق کرتے وقت انشائیہ نگار اکثر و بیشتر اس کے بنیادی وصف سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور جب وہ انشائیہ تخلیق کرتا ہے تو اس موضوع یا اشیاء کو ٹھیک اس ڈھنگ سے پیش کر دیتا ہے۔ جیسی اس کی پہچان ہے یا جو اس کی شکل ہے جس سے عام انسان بخوبی واقف ہوتا ہے اس لئے اس بنیادی نکتے کو فراموش کر دینے کی وجہ سے کوئی بھی تحریر انشائیہ بنتے بنتے رہ جاتی ہے اسکی تازگی اس کو حاصل نہیں ہوتی جس سے موضوع میں تیکھا پن یا انوکھا پن پیدا ہوتا ہے۔ احمد جمال پاشا کو انشائیہ کے فن میں مہارت حاصل تھی۔ انشائیہ تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ انشائیہ کے فنی محاسن کی بھی نشاندہی کی اور فنِ انشائیہ کی نزاکتوں لطافتوں سے خود بھی آشنا ہوئے اور قاری کو بھی انشائیہ تخلیق کر کے آشنا کیا۔ پاشا جب بھی انشائیہ تخلیق کرتے تو وہ کسی عام موضوع کو لیکر موضوع کا زاویہ بدل کر اس کے اندر چھپے ہوئے پہلوؤں کو اجاگر کرتے تو کبھی خود اپنا زاویہ بدل کر دیکھتے تو انہیں مونچھ کبھی گھڑی کی سوئی کے مانند معلوم ہوتی تو کبھی بچھو کے ڈنک کی مانند تو کبھی تلوار یا کٹار کی طرح دکھائی دیتی ہے کبھی بل کھاتی ناگن معلوم ہوتی تو کبھی پھن نکالے ناگن اور کبھی مکھی کی طرح ہونٹوں کے اوپر چپکی ہوئی معلوم ہوتی ہے مگر کہیں بھی پاشا نے مونچھ کو اسکی اصل شکل وصورت میں بیان نہیں کیا اور نہ ہی اسکو بال کی قسم سے موسوم کیا بلکہ اسے نئے انداز سے دیکھا۔ یہی انشائیہ کی ایک خاص خوبی ہے کہ اس کے بظاہر یک سطحی بیانیہ میں معانی کی کئی تہیں چھپی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ مونچھوں کے حوالے سے بھی پاشا نے کئی تاریخی حقائق کو اجاگر کیا ہے اور زمانے کی قدروں کو بتانے کی بھی کوشش کی ہے۔ مونچھوں کی انواع واقسام کا بیان بہت ہی سیدھے سادے انداز میں کیا ہے۔ نہ تو طنز نگار کا رویہ اختیار کر کے اس کا مضحکہ اڑایا ہے اور نہ ہی مزاح نگار بن کر تضحیک میں اسے لطیفہ بنا کر پیش کیا ہے بلکہ ایک انشائیہ نگار کی طرح اس سے لطف کشید کیا کرتے اگر انشائیہ نگار کا مطالعہ وسیع نہ ہو تو پھر انشائیہ میں اسلوب کی چاشنی

مشکل سے ہی نصیب ہوتی ہے زبان و بیان پر انشائیہ نگار کو قدرت حاصل ہونی چاہئے۔ انشائیہ نگار کا معاملہ یہ ہے کہ وہ شئے یا منظر کو محض ایک زاویے سے نہیں دیکھتا وہ ہمیشہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے تاکہ اس کے پوشیدہ پہلو منظرِ عام پر آسکیں۔

روز مرّہ اور گرد و پیش کی زندگی سے احمد جمال پاشا نے اپنے انشائیوں کے لئے موضوعات منتخب کئے ماحول کی ذرا ذرا سی تبدیلی اور زندگی کی معمولی سی بے ترتیبی سے انھوں نے اثر قبول کیا اور ردِّ عمل کے طور پر ان کے انشائیے وجود میں آئے۔ پاشا کا ہر انشائیہ زندگی کے کسی پہلو کے تاریک گوشے کو منوّر کرتا ہے۔ وزیر آغا نے سمندر کو دوسرے کنارے سے دیکھنے یا جھک کر اپنی ٹانگوں میں سر ڈال کر دنیا کو نئے زاویے سے دیکھنے کو انشائیہ کے مترادف بتایا ہے پاشا بھی زاویہ بدل کر کسی بھی شئے کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں کامیاب ہیں۔ انسان کی بنیادی ضرورتوں میں روٹی کپڑا اور مکان کا مسئلہ جوں کا توں دردِ سر بنا ہوا ہے۔ جس کی ایک وجہ ضرورت سے زیادہ آبادی ہے۔ ہر انسان کسی نہ کسی پناہ کی تلاش میں ہے لاکھوں لوگ اپنی بے مکانی کا رونا رو رہے ہیں اور غریبی، مفلسی، بیچارگی کی اس جنگ کو رات دن لڑ رہے ہیں عام انسان کی نظر سیدھے غریبی اور بے مکانی پر پڑتی ہے مگر انشائیہ نگار اسی شئے کو جگہ بدل کر یا اسے الٹ پلٹ کر اسکے مخفی مفاہیم کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ''ہجرت'' میں پاشا نے ہجرت کے نئے نئے امکانات کو ابھانے کی سعی کی ہے۔ ہجرت جیسے بے جان لفظ میں جان ڈال دی ہے اور اسے متحرک لفظ بنا دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہجرت میں روح پھونک دی ہو۔ ہجرت جیسا کہ نام سے ظاہر ہے عام زبان میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کو کہتے ہیں مگر پاشا نے اسے اپنے انشائیہ کا موضوع بنا کر انشائیہ نگار کا حق ادا کیا ہے۔ بظاہر یہ ایک بنجاروں کی بستی کا منظر بیان کرتے ہیں مگر فوراً ہی مرکزی خیال سے بہک جاتے ہیں اور بے بات کی بات شروع کر دیتے ہیں اور اپنی غیر سنجیدہ باتوں میں وہ بہت سی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن کو ہم دیکھتے تو ضرور ہیں ان سے واقفیت بھی رکھتے ہیں لیکن نہ کبھی انہیں محسوس کیا اور نہ کبھی ان کا بغور مطالعہ کر کے ان کے مختلف پہلوؤں پر سوچنے کی کوشش کی۔ مرکزی خیال سے بہکنے کے باوجود بھی پاشا اس کے اردگرد ہی گھومتے ہیں۔ بیان میں بے ربطی کا عالم یہ ہے کہ کبھی خانہ بدوش کا ذکر کرتے ہیں تو کبھی حضرتِ آدم کی ہجرت کا ذکر کرتے ہیں اور اسی سلسلے میں انسانی حیات و موت کا بھی ذکر کرتے ہیں اور انتقال کو ہجرت کی آخری کڑی تصور کرتے ہیں۔ ہجرت اور سیاست کا جب ذکر کرتے ہیں تو بے ربط باتیں کرتے ہیں۔ سیاست اور ہجرت کا رشتہ استوار کر

کے یہ بتاتے ہیں کہ کئی بار سیاسی ہجرت کی جاتی ہے اور گندی سیاست سے لوگ مہاجر بن جاتے ہیں۔ سیاسی ہجرت کے کئی تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ سیلاب، علاقائیت، غربت اور مذہب کے نام پر ہجرت سیاسی چال ہوتی ہے۔ اچانک ان سب باتوں سے گریز کر کے وہ سائنسدانوں کا ذکر شروع کر دیتے ہیں اور چاند پر جانے کی ان کی کوشش کو جنّت کا راستہ تلاش کرنے اور فردوسِ بریں کی طرف ہجرت بتایا ہے نوکری پیشہ کا ذکر کیا اور ٹرانسفر کے چکّر کو بھی ہجرت سے جوڑ دیا۔ ان تمام موضوعات کو وہ ایک مرکزی خیال کے دھاگے میں پروتے ہیں ان کی تمام باتوں میں منتشر خیالی یا بے ربطی ہے کبھی وہ زمین کی تو کبھی آسمان کی بات کرتے ہیں مگر ان سب میں غزل کی سی ہم آہنگی ہے بظاہر ان میں غزل کے شعر کی طرح موضوعات میں وسعت ہے مگر باطنی طور پر یہ سب ایک سلسلۂ خیال کی مختلف لہریں ہیں جو خیال کی سطح پر ابھرتی اور ڈوبتی رہتی ہیں جن کو کسی ماہرِ ادب نے انشائیہ کا غیر منطقی ربط کہا ہے تو کسی نے آزاد ترنگ کہا اور کوئی اسے بے ربطی تصور کرتا ہے۔ پاشا انشائیہ کے فن سے بخوبی واقف تھے اور انشائیہ کیا، اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انشائیہ کی اصطلاح پر ایک طویل مضمون لکھا جس میں انھوں نے مختلف ماہرینِ ادب کی آراء کو اکٹھا کر کے انشائیہ کی واضح تصویر پیش کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے جس سے انشائیہ کے خدوخال واضح ہو چکے تھے۔ جسے مدِّنظر رکھ کر وہ انشائیہ تخلیق کرتے۔ ابتدائی دور میں ان کے غیر ارادی انشائیوں میں ''آمد'' کی کیفیت ہے مگر بعد کے کچھ انشائیے جو بطور انشائیے لکھے گئے ان میں ارادتاً قصداً اور آورد کی کیفیت ہے۔ پھر بھی زبان و بیان کی شگفتگی اور موضوع کے انتخاب میں انوکھا پن ہونے کی وجہ سے انشائیہ میں بوجھل پن محسوس نہیں ہوتا۔ اور قاری کے ذہن پر زور بھی نہیں پڑتا۔ ملاحظہ فرمائیں ایک اقتباس جس میں وہ مغرب کی جانب ہجرت کو غلامی تصور کرتے ہیں جو ذہنی غلامی ہے:

> ''مغرب کی جانب ہجرت تو ایسی ہے جیسے کسی آزاد پنچھی کو سونے کے پنجرے میں قید کر دیا جائے۔ مغرب غلامی کی علامت ہے۔ اس میں ایک تو مہاجر کو تنہا ہجرت کرنی ہوتی ہے یہاں انصار کا کوئی قافلہ نہیں ہوتا...... مہاجر تو چھوٹا بھائی ہے جو اپنے مدار سے ہٹ کر گردش میں ہے۔ خود تو انتہائی بہتر مگر صبر آزما حالات میں ہے مگر دور دراز وطن میں اس کی بیوی اسکے آبائی گھر میں حسبِ اصول آبلے تھاپ رہی ہوگی یا کھانا پکانے میں باورچی خانہ کی سل پر مسالہ پیس رہی ہوگی۔''(۵)

ہجرت کر کے روزی روٹی کمانے کے لئے دوسرے ملکوں میں جانے والوں کو مادی سکون وآرام نصیب ہو جاتا ہے مگر ذہنی وجذباتی سکون نصیب نہیں ہوتا۔ ہجرت کے بعد بھی بے چینی اور ذہنی کشمکش میں وہ لوگ مبتلا رہتے ہیں۔ پاشا نے اسے سیدھے سادے انداز میں بیان کر کے حقیقت کے قریب لا دیا ہے۔ ہجرت سے جہاں سکون واطمینان ملتا ہے انسان زندگی کے مدار سے اوپر اٹھ جاتا ہے وہیں خاندانی حالات، سماج اور معاشرے سے کنارہ کشی کا احساس اسے ہمیشہ ہوتا ہے۔ جس سے ہجرت کا ظاہر و باطن الگ الگ معلوم ہوتا ہے۔ ایک انشائیہ نگار کی حیثیت سے پاشا نے اپنے انشائیہ ''ہجرت'' میں ایک طرف انشائیہ کے خدوخال اور ان کے بھی لوازمات کو مدنظر رکھا ہے تو دوسری طرف وہ طنز ومزاح نگار ہونے کے باوجود بھی ہجرت میں اسلوب کی تازہ کاری کے جوہر دکھائے ہیں نہ کہ طنز کے تیر برسائے ہیں۔ انشائیہ نگار کی حیثیت سے پاشا نے ایک ایسے لفظ کو اپنا موضوع بنایا ہے جس کی محدود وسعتیں تھیں مگر پاشا نے موضوع کو اپنی شخصیت سے مس کر کے اس کے نئے نئے گوشے کا انکشاف کیا جس کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ ہجرت میں بے ربطی، زبان وبیان میں بانکپن اور موضوع کے تنوع کے ساتھ ساتھ قاری کو مسرّت بہم پہنچانے جیسی تمام خصوصیات کا خاص خیال رکھا ہے۔ پاشا نے ازابتداء تاانتہا اپنے اسلوب کا خاص خیال رکھا۔ ادبی سفر کی شروعات کی تو چند ہی مضامین لکھنے کے بعد عالمی شہرت کے حامل ہو گئے ان کا مشہور زمانہ پیروڈی'' کپور ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' ان کے اسلوب بیان کی عمدہ مثال ہے جس میں انہوں نے اپنے زور قلم سے چند بلند پایہ ادباء وتنقید نگار کے طرز نگارش کی نقل اس انداز میں کی ہے کہ قاری مشکوک ہو جاتا ہے کیونکہ اس پر اصل تحریر کا گمان گزرتا ہے۔ یہ پاشا کے اسلوب بیان کی ہی خصوصیت ہے جو ان کے اولین زمانے کی کارکردگی ہے اس کے بعد تحریری زندگی کے پچیس سال گزارنے کے بعد ان کی تحریر میں شوخی پیدا ہو گئی جس سے ان کا اسلوب بیان نکھر کر سامنے آیا۔ یوں بھی طنز ومزاح میں اسلوب کی کارفرمائی زیادہ ہوتی ہے۔ پاشا کا خاص میدان طنز ومزاح تھا جس میں وہ لفظوں اور جملوں کے ظاہر و باطن کا خاص خیال رکھتے ہوئے طنز کے تیر چلاتے اور مزاح کے پھول بکھیرتے۔ اسلئے انشائیہ تخلیق کرتے وقت وہ اسلوب بیان پر اپنی توجہ مرکوز کرتے جس میں بے ربطی ہوتی اور الفاظ کی سلیقہ مندی بھی۔ جملے سادہ سپاٹ بھی ہوتے اور تہہ دار بھی۔ اسلوب میں ایسی بے ساختگی ہوتی کہ وہ گہری اور سنجیدہ بات بھی کہتے تو قاری کو کسی قسم کا بوجھل پن محسوس نہیں ہوتا۔ پاشا کے انشائیوں کا سب سے بڑا وصف ان کا رواں دواں اسلوب ہے جس میں وہ تصویر کے دوسرے رُخ کو اکثر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں

اور تصویر ان کے لفظوں سے، زبان وبیان سے، اور انداز بیان سے بنتی ہے۔ ان کا انداز نہایت سبک اور لطیف ہوتا ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں اپنے مطالب کو پیش کرنے پر قادر ہیں۔ پاشا کے اسلوب اور زبان وبیان کی مزید وضاحت ان کے انشائیوں کے درج ذیل اقتباسات سے ہو جائیگی:-

۱۔ ''دھوبی میلے کچیلے کپڑوں کا گٹھر لے جاتا ہے۔ صابن اور نیل لگا کر کھڑے گھاٹ دھوتا ہے۔ میل کچیل داغ دھبے دور کرتا ہے پھر انہیں کلف دے کر استری کر کے کپڑوں کی شخصیت چمکا دیتا ہے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں تنقید نہیں کر رہا ہوں فنکاروں اور فن پاروں کو پچھینچ اور چھانٹ رہا ہوں کبھی غالب کو دھوتا ہوں کبھی داغ کو کلف دیتا ہوں، کبھی اکبر کو سکھاتا ہوں تو کبھی پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی پر استری کرتا ہوں پھر لائبریری میں لانڈری کی الماری کی طرح سب کو تہہ کر کے رکھ دیتا ہوں۔''(۶)

۲۔ گویا ماقبل تاریخ کے زندہ عجائب گھر یا برٹش میوزیم کا نظارہ کر رہے ہوں۔ ٹیڑھی ٹیڑھی لکیریں، اونچی اونچی قطاریں، لہریادار، روشنی کی زنجیریں جو اپنے حصار میں طلسم ہوشربا کی طرح شہروں اور آبادیوں کو لئے ہوتی ہیں۔ غار، کھڈ، ٹیلے، ہر شئے ٹیڑھی ٹیڑھی آڑی، ترچھی ڈھیرے ڈھیرے غائب ہونے والی بھول بھلیاں رفتہ رفتہ جسکی ہر شئے تاریک دھبوں میں تبدیل ہو کر دھند میں تحلیل ہو جاتی ہے۔''(۷)

۳۔ ''بزرگ شطرنج اور چوسر کی بازیوں میں مصروف زمانے کی قیامت کی چال سے بے پرواشہہ دینے اور مات کھانے میں مصروف رہتے بھری پُری جوانیاں۔ ایک بیوی، ایک گھر، ایک گاؤں یا محلّے میں فصل کی طرح کٹ جاتیں، محلّے یا گاؤں پر اگر ہوائی جہاز گزر جاتا تو ہفتوں حسب توفیق قیاس و پرواز میں گزر جاتے''(۸)

۴۔ علیک سلیک اسکی مردانہ وار بالمشافہ گفتگو، اسکی پرشور بات چیت، فلک شگاف قہقہے، باتوں کا بڑھتا ہوا شور جو بہت جلد چیخ پکار میں تبدیل ہو کر محفل میں جان ڈال دیگا اور آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ موسم گرما کے جھلسا دینے والے پرتپش آگ اگلتے ہوئے موسم یا جاڑوں کی کڑاکے کی سردی کی ٹھٹھرن کے بعد

ایک دم سے موسم اور مزاج انتہائی شگفتہ ہو گیا (۹)

متذکرہ بالا چاروں اقتباسات پر نظر ڈالیں تو پاشا کے زبان و بیان اور طرز نگارش کا اندازہ بہ آسانی ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے اور تکرار لفظی یا صوتی آہنگ سے جملے کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ جس سے قاری لطف کشید کرتا ہے اور سرور انبساط و مسرت آفرینی کا پہلو بھی اس میں چھپا ہوتا ہے جس سے بغیر ذہنی ورزش کے سلاست اور روانی کے ساتھ رواں دواں انداز میں الفاظ کے دھارے بہتے ہیں۔ پاشا نے جہاں زندگی کے چھوٹے چھوٹے موضوعات کو طنز کا نشانہ بنایا ہے وہیں روزمرہ کے مسائل سے ہٹ کر ادب کے مسائل پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔ خاص کر اردو ادب سے وہ بے انتہا مایوس نظر آتے ہیں جس کی تصدیق ان کے مختلف مضامین سے ہو جاتی ہے مثلاً "ادب میں مارشل لاء" "ادب میں بینک بیلنس" "ادب میں بانس کی اہمیت" "تماشائے ادب" اور "رہنمائے تنقید نویسی جدید" وغیرہ اہم ہیں جس میں ادب کی بے راہ روی کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ انشائیہ نگاری کے میدان میں بھی وہ فطرت کی تابعداری کرتے نظر آئے ان کی حساس طبیعت نے پھر ادب کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی۔ انشائیہ جیسی مشکل ڈگر پر بھی وہ ادب کی حمایت کا علم بلند کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ "کچھ تنقید کے بارے میں" ان کے اسی فطری رجحان کی پیداوار ہے وہ گاہے بگاہے ادب پر ایک ترچھی نظر ڈالتے اور ادب میں پھیلی بدعنوانیوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ایک جگہ انشائیہ نگار کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> "انشائیہ نگار اپنے انشائیہ کی تعمیر میں وہی کچا مواد زیادہ مقدار میں بروئے کار لاتا ہے جو اسے میسّر ہوتا ہے مثلاً اگر وہ شاعر ہے تو شعریت کا استعمال زیادہ کرے گا، اگر افسانہ نگار ہے تو افسانویت کا، اور اگر مزاح نگار ہے تو مزاح کا، اس سے اس کا انشائی لہجہ مرتب ہوگا۔" (۱۰)

انشائیہ کے لئے طنز و مزاح شجر ممنوعہ نہیں بلکہ اس کو وسیلہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ پاشا کا فطری رجحان بھی انکے انشائیوں میں جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے انشائیوں میں طنز کا برمحل استعمال کر کے اپنے انشائیوں کو حسن بخشتے ہیں۔ "کچھ تنقید کے بارے میں" آج کل کی تنقید نگاری پر یوں طنز کرتے ہیں:-

> "میں اپنے ذہنی میزان نقد پر کرسیوں کو تولنے اور کرسی پر بیٹھے ہوئے فن کار کی شخصیت کی تہوں میں غواصی کا عمل جاری رکھتا ہوں اس کی ذات صدصفات میں تہہ نشیں سیپوں کے موتی نکال کر اس کے شخصی تاج میں پروتا رہتا ہوں۔" (۱۱)

پاشا کی فطرت میں طنز کا خمیر تھا اور مزاح انکی شخصیت کا اٹوٹ حصہ تھا۔ وہ بات بات میں مزاحیہ جملے کستے اور طنز کے تیر چلاتے۔ مگر ان کا طنز کچھ ایسے ہلکے پھلکے انداز میں ہوتا کہ قاری کو اس کی چبھن محسوس نہیں ہوتی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔ ملک، قوم، مذہب، سرکار، دفتر، اسپتال، ادب، اخبار اور نہ جانے کن کن موضوعات پر وہ قلم اٹھاتے۔ برمحل طنزیہ جملے ان کے انشائیوں کی جان ہیں۔ طنز کا غالب رجحان ان کے مضامین میں پایا جاتا ہے مگر انشائیہ بھی اس سے اچھوتا نہ رہ سکا پھر بھی انشائیہ میں اسلوب کی شگفتگی اور انداز بیان کی لطافت غالب ہے۔ کہیں، کبھی، کسی پر بھی وہ بے باکانہ طنز کرتے ہیں وہ نتیجہ کی فکر کئے بغیر ہی بہ آواز بلند سرکار کی کمیوں پر نکتہ چینی کرتے اور اس کے تہہ در تہہ وہ اپنے کام کی بات کہتے چلے جاتے ہیں دنیا کی بے ثباتی کا رونا سبھی نے رویا ہے مگر پاشا نے یہ بتایا ہے کہ آج کل کے اس جدید دور میں جہاں ہر لمحہ کوئی نہ کوئی نیا مسئلہ سرکار کے سامنے ہوتا ہے جمہوریت میں مسائل کے انبار ہیں خواہ وہ آبادی کا مسئلہ ہو، یا آبادکاری کا مسئلہ ہو، تعلیم کا مسئلہ ہو یا خواندگی کا مسئلہ، منصوبہ بندی کا مسئلہ ہو یا نشہ بندی کا مسئلہ، پل کا مسئلہ ہو یا سڑک کا مسئلہ، بجلی کا مسئلہ ہو یا پانی کا مسئلہ یا صفائی کا مسئلہ انسانی زندگی کے ہر مسائل کا حل چیخ اور چیخنے میں مضمر ہے۔ پاشا نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آج کے ماحول میں خاموشی سب سے بڑی نحوست ہے اس لئے

جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

والی بات ہے سب کو اپنا حق چھیننا ہوگا۔ مانگنے سے اب کچھ نہیں ملتا جس کے لئے جلسہ کرنا ہوگا۔ جلوس نکالنا ہوگا، نعرہ لگانا ہوگا، یا پھر ہم کہہ سکتے ہیں کہ چیخنا ہوگا۔ جس سے روتے ہوئے بچے کی کیفیت طاری ہو جائے اور دودھ کی شکل میں مشکلیں آسان ہو جائیں یا اصلاحات ہو جائیں تمام باتوں کا نچوڑ پاشا نے صرف چند جملوں میں بیان کر دیا ہے اور ان کے ہر ایک لفظ سے طنز ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں "چیخنا" سے ایک اقتباس:

> "چیخنا میرے خیال میں ایک تعمیری فعل ہے اگر چیخا نہ جائے تو اصلاحات عمل میں نہ آئیں۔ سڑکیں اور پل خاموشی سے تو بن نہیں سکتے، صفائی ستھرائی کی نوبت تو آ نہیں سکتی۔ سماج میں ہر خوشگوار اضافے کا سر کسی نہ کسی چیخ کے بطن سے برآمد ہوتا ہے۔ چیخنے کی اجازت نہ دینا سراسر عسکریت ہے۔" (۱۲)

یوں تو طنزیہ جملے انکے بھی انشائیوں میں موجود ہیں مگر اسلوب بیان کی نزاکتوں اور سادگی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے پاشا نے طنز کے تیر برسائے ہیں جس سے تبسم زیر لب کی کیفیت میں قاری پر انشائیہ نگار کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے جو قاری کو دعوتِ فکر اور ذہنی تحریک دیتی ہے۔ انشائیہ کے اختتام پر وہ لمحہ بھر کیلئے ہی اس تیکھے اور طنزیہ جملے پر غور ضرور کرتا ہے کیونکہ وہ تیکھے جملے اس کے ذہن میں مختلف سوالیہ نشان ابھارتے رہتے ہیں اور اس کو غور وفکر کے لئے اکساتے ہیں ملاحظہ فرمائیں چیخنا سے ایک اور اقتباس جس میں پاشا نے پارلیمنٹ پر کاری ضرب لگائی ہے:

> چیخ دراصل ایک اضطراری عمل ہے۔ ہم کسی بھی خلاف توقع بات پر بہ آسانی چیخ سکتے ہیں کیونکہ چیخنا ہمارا پیدائشی حق ہے چیخنا عین جمہوری عمل ہے جمہوریت اور جمہور کا فرض ہے صرف چیخنے اور چخوانے کیلئے ہم پارلیمنٹ اور اسمبلیاں بناتے ہیں الیکشن لڑتے ہیں۔ کروڑوں انسان اپنا سارا کام کاج چھوڑ کروڑوں کی لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے ہوئے ووٹ اور بوگس ووٹ دیتے ہیں پھر ایوان میں اتنا چیختے ہیں کہ بار بار ایوان سے نکالے جاتے ہیں یہاں یہ بھی کمزور طبقہ یعنی حزب اختلاف ہی چیخ کا پرچم بلند رکھتا ہے کیوں کہ یہ اس کا بنیادی اور دستوری حق ہے۔'' (۱۳)

پاشا نے چیخنے جیسے موضوع اور مہمل عمل کو بھی موزوں بنادیا ہے۔ چیخنے کے عمل کی مختلف تہوں کو ابھارا ہے اور اس میں بے بات سے بات پیدا کی ہے اشارتاً طنز بھی کیا ہے اور بڑی بڑی بات کو چھوٹے چھوٹے سیدھے سادے جملوں میں بیان کر کے چیخنے کے مختلف مدار اور مخفی مفاہیم کو نیا زاویہ عطا کردیا ہے۔ چیخنا یا پارلیمنٹ کا موازنہ بڑے ہی اچھے انداز میں پاشا نے کیا ہے پارلیمنٹ کے ارکان کی کارکردگی کو صرف دو جملوں میں نمایاں کیا ہے ساتھ ہی ساتھ عوام کی قربانیوں اور کارگزاریوں کا ذکر بھی کرنے سے نہیں چوکتے جو اپنے نمائندوں کو منتخب کرنے کی خاطر ووٹ اور بوگس ووٹ کا حربہ استعمال کرتے ہیں لیکن ان سب کے باوجود ان کا مقصد چیخنا اور صرف چیخنا ہی رہ جاتا ہے اس کا جمہوریت سے۔ جس خوبصورت انداز میں تقابل کیا ہے وہ ان کے وسیع مطالعے اور عمیق مشاہدے کی بہترین مثال ہے۔ جب کہ رشید احمد صدیقی نے بھی پارلیمنٹ کو یا اسمبلی کو ارہر کے کھیت سے ملادیا ہے۔ جیسے ارہر کے کھیت میں بیٹھ کر کسان بڑے بڑے فیصلے کر لیتے ہیں ویسے ہی ملک کے ان اہم ایوانوں میں بیٹھنے والے بھی کبھی کبھار کوئی اہم فیصلہ لے لیتے ہیں لیکن ارہر کے کھیت اور

ایوانوں میں دونوں جگہوں پر اپنی اپنی بات کہنے کا حق حاصل ہے کہیں تفریحی ہے تو کہیں سنجیدہ۔ پارلیمنٹ کے ایوان کے ممبر کا مقصد صرف چیخنا ہی ہے یہ بات پاشا نے اپنے انشائیہ چیخنا میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جبکہ انہوں نے جمہوری آئین کا حوالے بھی دیا اور حزب اختلاف کو چیخنے کا دستوری حق بھی دلوایا۔ یہاں رشید احمد صدیقی اور احمد جمال پاشا کی فنی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے کہ غور فکر، قوت مشاہدہ، تجربات اور وسیع مطالعہ کے باوجود بھی انداز بیان میں انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے۔ (ٹھیک ویسے ہی جیسے انشائیہ نگار موضوعات میں نئے نئے امکانات کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے)، ایک ہی موضوع پر الگ الگ انداز میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ چیخنا اور شور مچانا بظاہر دو الگ الگ عمل ہے مگر دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے کیونکہ جب بھی ہم چیخیں گے تو شور ہوگا۔ اور شور مچانا ہے تو چیخنا ہوگا۔ مگر احمد جمال پاشا نے ''شور'' اور ''چیخنا'' دو الگ الگ انشائیے لکھ کر ثابت کردیا ہے کہ انشائیہ نگار کیلئے موضوعات کی قید نہیں بلکہ وہ جب چاہے جیسے چاہے اور جن معنوں میں چاہے استعمال کرسکتا ہے۔ موضوعات کی بوقلمونی اور انشاپردازی کے جوہر دکھانے میں انشائیہ نگار موضوعات کا انتخاب بہت احتیاط سے کرتا ہے۔ ہر موضوع کے ساتھ ساتھ وہ زاویہ نگاہ اور انداز فکر کا بھی تعین کرتا ہے۔ کسی بھی چیز کو جو بظاہر کچھ ہے لیکن اس کے باطن میں بہت سی چیزیں پوشیدہ ہوتی ہے اس کی پرتوں کو اتار کر پیش کرنے کا فن انشائیہ نگار کو آنا چاہئے پاشا کو اس فن میں مہارت حاصل تھی۔ جس کی مثال ان کے انشائیے ''شور'' اور ''چیخنا'' ہیں مثال کے طور پر دونوں سے ایک ایک اقتباس پیش ہے:

> شور ہمیشہ سامنے سے مردانہ وار بڑھتا ہے بھرے بازار اور بھری محفل میں طبلِ جنگ بجاتا ہوا داخل ہوتا ہے اور دور دور تک اپنی آمد کا بانگ دہل اعلان کرتا ہے۔ محفل شادی ہو یا نوحۂ غمی، تقریب خوشی ہو یا عبادی اجتماع، شور ہر انسانی مجلس کا دیباچہ ہے اگر شور شروع نہ ہوا تو اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی محفل جمی نہیں ہے۔'' (۱۴)

اب ملاحظہ فرمائیں چیخنا سے ایک اقتباس:

> ''غرض کہ شادی کی پوری فوج کا انتظام صرف چند لوگ کرتے ہیں کوئی وہاں پر چیختا نظر آتا ہے جہاں پر کھانا پک رہا ہے کوئی جہاں بارات ٹھہری ہے اور کوئی جہاں کھانا کھلایا جائیگا یا کھانا کھلایا جارہا ہے اور کہیں ان سب ہی مقامات پر

> آپ کو صرف ایک ہی آدمی چیختا نظر آئے گا۔ اگر یہ چیخیں نہ سنائی دیں تو سمجھ جائیے کہ یہاں نہ کوئی انتظام ہے اور نہ انتظام ممکن ہے۔" (۱۵)

اگر ہم اردو انشائیہ نگاری کا جائزہ لیں تو ایک بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ کچھ ادیب اپنی عمر کا طویل حصہ گزارنے کے بعد انشائیہ نگاری کی طرف راغب ہوئے۔ خواہ وہ حسنین عظیم آبادی ہوں، یا جاوید وشِشٹ، رام لعل نابھوی ہوں، یا وزیر آغا انور سدید ہوں یا پھر احمد جمال پاشا۔ کبھی نے پہلے اپنی شناخت اردو ادب میں قائم کی پھر انشائیہ کی طرف راغب ہوئے۔ کسی نے طنز و مزاح کی دنیا میں پہلا قدم رکھا تو کسی نے پہلے افسانہ لکھنا شروع کیا۔ کسی نے تحقیق و تنقید کے فرائض انجام دیئے تو کسی نے شاعری میں طبع آزمائی کی پھر بعد میں سبھی انشائیہ نگار کہلائے۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار کی شخصیت جتنی عظیم ہوگی اس کے اندر معنوی گہرائی بھی اتنی ہی ہوگی، موضوع کا نیا پن، اسلوب کی شگفتگی بھی انشائیہ نگار کی فکری بصیرت پر منحصر ہے۔ معیاری انشائیہ کی تخلیق کیلئے انشائیہ نگار کی شخصیت میں پختگی ضروری ہے۔ انشائیہ نگار کے پاس کوئی جذبہ، کوئی موضوع نہیں ہوتا پھر بھی وہ اپنی فنکارانہ مہارت اور تکنیکی چابکدستی سے بہترین انشائیہ تخلیق کر لیتا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انشائیہ کی ڈگر آسان نہیں بلکہ یہ مشکل راستہ ہے جہاں فنکار اپنی فنی پائیداری کے بعد سفر کرتا ہے کیونکہ اس وقت تک اس کی تحریر میں پختگی آ چکی ہوتی ہے اور اسے زبان کو تخلیقی انداز میں استعمال کرنے پر قدرت حاصل کر چکا ہوتا ہے دوسرے اس کی فکر و نظر میں وسعت اور مشاہدات و تجربات میں گیرائی و گہرائی پیدا ہو چکی ہوتی ہے۔ احمد جمال پاشا نے بھی اسی طرز پر باضابطہ انشائیہ نگاری کی شروعات کی انہوں نے انشائیے عمر کے آخری دس سال میں لکھے۔ جن میں وہ سبھی چیزیں موجود ہیں جو ایک معیاری انشائیہ کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ انشائیہ کی تمام خصوصیات میں انکشاف ذات اور موضوع کا تنوع دو ایسی خصوصیات ہیں جو اکثر و بیشتر ایک دوسرے میں تحلیل معلوم ہوتی ہیں انشائیہ میں شخصی رنگ کی کارفرمائی ہوتی ہے جس کے ذریعہ مصنف اپنی شخصیت اور ذات کے مختلف پہلوؤں کا انکشاف انشائیہ کے پس منظر میں کرتا ہے۔ انشائیہ میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ انشائیہ خواہ عنوان سے مربوط ہو یا نہ ہو مگر انشائیہ نگار کی شخصیت یا ذات سے مربوط ہونا لازمی ہے۔ دوسری طرف انشائیہ میں موضوعات کے تنوع اور رنگارنگی سے انشائیہ اپنے فنی عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ کہیں کہیں پاشا کے یہاں شخصیت کا اظہار اور موضوع کا تنوع دونوں باہم گتھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ انشائیہ کی تمام خصوصیات ایک زنجیر کی مختلف کڑیاں ہوتی ہیں مگر یہ تمام کڑی ایک

دوسرے سے مربوط ہوتی ہیں یہ پھول کے ہار کی مانند ایک دھاگے میں پروئی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ جہاں انشائیہ نگار اپنی ذات کا انکشاف انشائیہ میں کرتا ہے۔ انشائیہ کو اپنی شخصیت کا لمس عطا کرتا ہے وہیں اس میں بے بات کی بات شروع کر دیتا ہے جس سے اس کا رشتہ موضوع سے جڑ جاتا ہے اور اس بے بات کی بات میں وہ موضوع کے مختلف پہلوؤں کو اپنی ذات کے حوالے سے اجاگر کرتا ہے جس سے موضوع میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔ پاشا انشائیہ کے فن سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہیں ان کے انشائیوں میں تخلیقی اسلوب کارفرما ہوتا ہے اور وہ انشائیہ کی تمام خصوصیات کو ان کی فنی نزاکتوں کے ساتھ برتتے ہیں۔ پاشا نے اپنے کئی انشائیوں میں انکشاف ذات اور بے بات کی بات میں ایسے نکات پیدا کئے ہیں کہ قاری پڑھکر حیران رہ جاتا ہے۔ "کچھ تنقید کے بارے میں" سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں جس میں پاشا تنقید نگار کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اور دور حاضر میں تنقید کی دنیا میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں کو اس احتیاط سے منظر عام پر لاتے ہیں کہ وہ طنز کے زمرے میں شامل ہونے سے بھی بچ جاتے ہیں اور انشائیہ کی میزان پر بھی کھرے اترتے ہیں:

> "میں اپنے آپ کو باغ کا مالی محسوس کرتا ہوں، گلستاں کو خس و خاشاک سے پاک کرنے والا، جھاڑ جھنکاڑ، کوڑا کرکٹ، مرجھائے پھول، سوکھی پتیاں، کرکٹ کے ڈھیر بنا بنا کر انہیں دیا سلائی دکھا کر سلگاتا ہوں کہ دھوئیں سے کیڑے مکوڑے مر جائیں۔ جلی ہوئی پتیوں کی بہترین کھاد ہوتی ہے روشوں کو درست کرتا ہوں۔ فالتو ٹہنیاں کاٹتا چھانٹتا ہوں، سوکھے خشک اور سڑے پودے نکال کر پھینک دیتا ہوں، باغبانی کے اس پسندیدہ عمل میں سے مجھے مغربی تنقید کے اصول جھانکتے دکھائی دیتے ہیں۔ دراصل اصول تو ارسطو اور افلاطون کے زمانے سے ہمارا تعاقب کر رہے ہیں لیکن اپنی پیاری زبان میں اصولوں پر چلنے سے کہیں خوشگوار اور پر عافیت بات ان کا ذکر خیر کرتے رہنا ہے۔ میں اصولوں کی ترازو لے کر بیٹھ جاتا ہوں ذہنی ارتعاش کے ساتھ بہت سی صورتیں بجلی کی طرح چمکنے لگتی ہیں جن سے نہ میں آنکھ چرا سکتا ہوں نہ چار کر سکتا ہوں آخر کے سمیٹوں کے چھوڑوں۔" (۱۶)

ادب کی اصلاح انکا محبوب مشغلہ ہے وہ زمانے اور معاشرے کی اصلاح کیلئے جتنا کوشاں رہتے ہیں اتنے ہی ادب کے معیاری اور اعلیٰ ہونے کیلئے فکر مند رہتے وہ ہمیشہ قاری اور ادیب کی توجہ

اپنی تحریر کی طرف مرکوز کراتے ہیں اور بہ ذات خود ایسا ادب بھی تخلیق کرتے ہیں جس سے ادیبوں کی بے راہ روی اور گمراہی کا پتہ چلے اور وہ اپنی اصلاح بھی کر سکیں اس کے لئے طنز و مزاح کا حربہ کافی ہے وہ نثری شاعری ہو یا مشاعرہ بازی انہیں کسی سے شکوہ نہیں بلکہ انہیں صرف اعلیٰ ارفع اور عمدہ ادب چاہیے۔ اپنے انشائیہ ''چیخنا'' میں اناؤنسر کے فرائض اور مشاعرے کی صورت حال پر ایسے ایسے نکات واضح کئے ہیں کہ ان کے اس تہہ در تہہ پرتوں میں کئی عقل و فہم کی باتیں سامنے آئیں جن سے مشاعرے کی اصلاح کی جاسکتی ہے۔ ''نثری شاعری'' ہو یا ''ادب میں مارشل لاء'' ہر دور میں بہترین ادب کی حمایت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

پاشا دنیا کی بے ترتیبی سے بھی خوش نہیں ہیں بلکہ انہیں یہ بے حسی کا عمل لگتا ہے۔ انسانی فطرت میں بے ترتیبی ہو یا آسمانی بے ترتیبی، زمینی بے ترتیبی ہو مکانی بے ترتیبی ادب کی بے ترتیبی ہو بہر حال انہیں اس بے ترتیبی سے گلہ اور شکوہ ہے۔ انکا ماننا ہے کہ جیسے کھیتوں کی پیائش کر کے چک بندی کی گئی اور ساری زمین یا پلاٹ میں حسن ترتیب پیدا ہو گیا ویسے ہی وہ ملک کے نقشے کو دیکھ کر یہ خواہش ظاہر کرتے ہیں کہ گلوب کے تمام نقشوں کی چک بندی کر دی جائے تاکہ ہر ملک مربع کی شکل اختیار کر لے اس کے پس پردہ دو ملکوں کی آپسی نا اتفاقی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو اسی زمین یا نقشے کی بے ترتیبی میں چھپی ہوئی ہے۔ ''بے ترتیبی'' اردو انشائیہ کی ایک خصوصیت بھی ہے۔ انشائیہ میں اگر بے ترتیبی اور غیر سنجیدگی نہیں، بے ربطی نہیں تو پھر وہ انشائیہ کے زمرے سے خارج کیا جاسکتا ہے۔ بے ربطی اور بے ترتیبی سے انشائیہ نگار کو خیال کی آزادی مہیا ہوتی ہے۔ جس سے وہ تخیل کی پرواز بلند سے بلند تر کرتا جاتا ہے اور غواصی میں سمندر کی گہرائی میں غوطہ لگا کر موتی نکالتا ہے۔ پاشا کا انشائیہ ''بے ترتیبی ایک علامتی انشائیہ بھی ہے۔ جس میں انشائیہ کی خصوصیت کی طرف اشارہ بھی ہے اور انشائیہ کے فنی محاسن کو عملی طور پر بھی پہنچوانے کی کوشش کی ہے۔ اس عمل میں پاشا بہت احتیاط سے اپنی ذات کے تہہ در تہہ باطنی اسرار و رموز کو آہستہ آہستہ کھولتے جاتے ہیں جس سے قاری کو لطافت اور مسرت کے چند لذت خیز لمحات مہیا کرنے میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں جو انشائیہ کا خاص وصف ہے۔ پاشا نے اپنے انشائیہ ''بے ترتیبی'' میں انکشاف ذات اور شخصیت کے دلکش پہلو کو موضوع کے تنوع سے کس طرح ممیز کیا ہے۔ اس کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

شام کو میری بہترین تفریح آسمانی بائسکوپ ہے چارپائی پر لیٹا ہوا اپنے

وجود سے بے نیاز آوارہ بادلوں کے رنگ برنگے ٹکروں سے بنتی مٹتی تصویریں دیکھتا رہتا ہوں ایک بڑا سا بادل سمٹ کر پہاڑ بن گیا۔ پہاڑ کا دامن بڑھتے بڑھتے اونٹ ہو گیا اونٹ کے نیچے پہاڑ نظر آنے لگا جو پارۂ ابر چڑیا معلوم ہو رہا تھا اب ہاتھی سے بھی بزرگ تر سیمرغ بن بیٹھا۔ اس کی دیومالائی چونچ تحلیل ہو کر بڑا انسانی چہرہ بن گئی جس کے گدھے کی طرح لمبے لمبے کان نمودار ہو گئے۔ سونڈ نکل آئی جو بڑھتے بڑھتے اژدہا ہو گئی۔ اژدہا بڑھکر گھڑیال معلوم ہونے لگا۔ سمٹا تو قطب مینار ہو گیا۔ رفتہ رفتہ مینار پھیل کر نیلی جھیل میں تبدیل ہو گیا۔ جھیل پہاڑوں میں روپوش ہو گئی نفسِ انسانی کی طرح اب سیماب یا ابر پاروں کو قرار نہیں بادل کے ٹکڑے یوں پلک جھپکنے میں بدل جاتے جیسے آدمی بات بدل دیتا ہے۔'' (۱۷)

انشائیہ نگار موضوع پر خود کو اس طرح مرتکز کر لیتا ہے کہ ارد گرد کے تمام موضوعات کی مداخلت بے جا نہیں معلوم ہوتی بلکہ انشائیہ نگار اسے اپنی تخلیقی کاوش اور سلیقہ مندی سے مرکزی موضوع سے مربوط کر دیتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ذات کو دخیل رکھتا ہے۔ پاشا نے اس حسن کو اپنے انشائیوں میں بخوبی اپنایا ہے۔ پاشا پہلے اپنی ذات کو داخل کرتے ہیں پھر وہ موضوعات کو داخل کرتے ہیں بعد میں ان سے ایسے کھیلتے ہیں جیسے کوئی بچہ کھلونا پا کر پہلے تھوڑی دیر تک اسے حیرت واستعجاب سے دیکھتا ہے اور ایک لحۂ فکریہ میں ڈوب جاتا ہے پھر چند لمحے کے بعد وہ اس سے اس بے تکلفی سے کھیلنا شروع کر دیتا ہے جیسے وہ کھلونے سے واقف تھا مگر اس کے مختلف زاویوں سے واقف نہیں تھا۔ پاشا بھی اپنی ذات میں بے تکلفی کی چاشنی لگا کر انشائیہ کا مزہ بدل دیتے ہیں مگر تمام باتوں میں انشائیہ نگار کی ذات کو اولیت حاصل ہے۔ پاشا کے انشائیہ ''بور'' سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اسی لئے میں کبھی کسی بور سے بور نہیں ہوتا۔ بور میرے نزدیک ایک قابلِ رحم انسان ہے۔ جو آپ سے ایک چٹکی وقت کی بھیک مانگتا ہے تاکہ وہ آپ کو یقین دلا سکے کہ وہ ایسا بھی گیا گزرا نہیں جیسا کہ آپ اسے دیکھ یا سمجھ رہے ہیں۔ وہ ماضی بعید کے شاندار دور کا ہیرو ہے، گزشتہ تہذیب وتمدن میں دلچسپی ہے تو آخر اس تاریخ پارے کو آپ سینے سے کیوں نہیں لگا لیتے یہ بھی تو ماضی کے صحیفے کا ریکارڈ ہے جس کی سوئی پھسنے پر آپ بہ آسانی سوئی اٹھا کر موضوع تبدیل

کر سکتے ہیں۔'' (۱۸)

پاشا کو لفظ بور سے کافی انسیت تھی۔ انشائیہ کے قبل بھی انہوں نے ''بور کی قسمیں'' ایک انشائیہ نما مضمون لکھا تھا جس میں صرف ذہن کی آزاد ترنگ، بات بنانے اور اسلوب بیان کا جادو جگانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ موضوعات کے تنوع کا عالم یہ ہے کہ اُسے کھینچ تان کر ایک مضمون کی شکل دے دی گئی جس میں بور ہونے، بور کرنے، بور اور بور کرنے والوں کی قسموں وغیرہ کو بہت ہی طوالانی انداز میں بیان کیا گیا ہے اس کو سمجھنے کیلئے ایک روشن دماغ چاہئے پاشا خود بور کرنے پر تلے ہیں مگر اسلوب بیان اور طرز نگارش کے سبب قاری کا تجسس ختم نہیں ہوتا اور قاری اسے پورا پڑھ ڈالتا ہے۔ قاری پر مضمون کی گرفت کافی مضبوط معلوم ہوتی ہے۔ وہیں وہ پھر اسی موضوع پر دوبارہ قلم اٹھاتے ہیں تو ان کا زاویہ نظر بالکل جدا ہے۔ وہ انشائیہ ''بور میں مختلف موضوعات کو شامل کرتے ہیں مگر ان سب میں ایک ربط و تسلسل ہے بظاہر بے ربطی ہے مگر اندرونی سطح پر یہ مختلف موضوعات ''بور'' یا مرکزی خیال سے مربوط معلوم ہوتے ہیں۔ متذکرہ بالا اقتباس میں ایک بے کار انسان کی طرف اشارہ ہے جو آپ سے مل کر خوش ہوتا ہے اور آپ مروتاً بور ہوتے ہیں۔ اس کے پس پردہ ''پدرم سلطان بود'' کی روایت کا پتہ چلتا ہے جس سے زوال پزیر معاشرے کا احساس ہوتا ہے جو آج تک صرف اس امید پر زندہ ہے کہ وہ ماضی بعید کا ہیرو ہے اس کی اپنی تہذیب ہے اپنا تمدن ہے مگر آج اس کی حیثیت موروثی ذخیرہ سے زیادہ نہیں لیکن وہ موروثی ذخیرہ کوڑا کرکٹ سے کم نہیں جسے سینے سے لگانے کے بدلے لوگ اسے بے کار سمجھ کر ٹال جاتے ہیں۔ اس مضمون کی تہہ میں جائیں تو اس میں جدید ذہنیت جھلکتی ہے جس کے لئے موروثی ادب یا موروثی صحیفہ بور سے زیادہ نہیں بلکہ وہ وراثت سے بغاوت کر کے جدیدیت کی طرف گامزن ہے جو ریکارڈ کی پھنسی ہوئی سوئی کو بدل کر موضوع تبدیل کر دیتے ہیں لیکن انسانی نفسیات یا بوریت کی تہہ تک نہیں جاتے کہ بوریت کی اصل جڑ کیا ہے۔ ''بور'' کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ ملک میں بیکاری اور بے روزگاری کا عالم یہ ہے کہ پڑھے لکھے عالم فاضل لوگ تلاشِ روزگار سے تھک ہار کر وقت کاٹنے پر مجبور ہو گئے اور ان کا مشغلہ ہی دوسرے کے سہارے پر دن کاٹنا بن چکا ہے۔ لوگ انہیں خبطی اور پاگل سمجھتے ہیں۔ جنہیں ماڈرن عہد میں 'بور'' تصور کیا جاتا ہے مگر یہ بور کم، وقت کے مارے زیادہ ہیں۔ جنہیں آج کے اس تیز رفتار دور نے اپاہج بنا دیا ہے۔

پاشا کسی بھی چیز کو اس کے ماحول اور پس منظر میں دیکھتے ہیں پھر اسے اسلوب کا پیکر عطا

کر کے صنفی حیثیت عطا کرتے ہیں پاشا نے بھی اپنے تمام انشائیے کا تانا بانا اپنے گردوپیش سے بنا ہے۔ اس لئے اس میں وہی ماحول اور فضا ہوتی ہے جس میں پاشا خود بھی سانس لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ پاشا کے انشائیوں میں یکسانیت یا جمود نہیں پایا جاتا بلکہ وہ اپنے تخلیقی ذہن سے نئے نئے موضوعات کو اخذ کرتے اور اسے وہ اپنے زاویئے سے دیکھتے اور اسے اسلوب کا پیکر عطا کر کے صنفی حیثیت عطا کر دیتے۔ ''بلّیوں کے سلسلے میں'' پاشا کا ایک ایسا ہی انشائیہ ہے جس میں معاشرے کے ظاہر و باطن کی خوبیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ بلّی جو پالتو جانوروں میں سب سے عزیز ہوتی ہے اس کی حرکات و سکنات کو پاشا نے بڑے ہی اچھے انداز میں قلم بند کیا ہے۔ بلّی کا پالتو ہونا، دودھ پینا کوئی نیا عمل نہیں ہے جسے انشائیہ کا موضوع بنایا جا سکے مگر ساتھ ہی ساتھ پاشا نے موضوعات میں تنوع پیدا کر کے اس میں موازنہ کا سلسلہ شروع کیا اور زاویہ بدل بدل کر بلّی کے مختلف روپ کو اس طرح دیکھا ہے کہ وہ انشائیہ کے حدود میں داخل ہو گیا ہے۔ وہ بلّی کو خوددار اور انسان کو لالچی بتاتے ہیں۔ بھکاری پیٹ بھرنے کے بعد دعائیں دیتا ہے۔ جوگی راگ الاپتا ہے اور گیان دھیان لگاتا ہے جبکہ بلّی پیٹ بھرنے کے بعد نو دو گیارہ ہو جاتی ہے۔ بلّی کا پیٹ بھرا ہو تو اسے فکر نہیں ہوتی جبکہ انسانی خواہشات ختم ہی نہیں ہوتی۔ بلّی اور جوگی کے گیان دھیان کا موازنہ، بلّیوں کی لڑائی کا موازنہ دو حکومتوں سے، بلّیوں کے رونے اور غرّانے کو عشق و عاشق کا مکالمہ بتا کر پاشا نے اپنے تعمیری اور تخلیقی اسلوب کا مظاہرہ کیا ہے ملاحظہ ہوں چند اقتباسات:

(i) آدمی مست ہو یا مستعد بنیادی طور پر اسکے اندر ایک بلّی چھپی گیان دھیان میں مصروف رہتی ہے اور ہر بلّی کے اندر انسانی روح اپنے پورے خیر و شر کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے...... مگر پالتو ہونے پر اس میں اور عام پیشہ ور بھکاری یا جوگی میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا..... کھانے کے بعد دونوں نہیں نظر آتے۔'' (۱۹)

(ii) ''اس عشق میں بنیادی اہمیت محبوب اور عاشق کے درمیان ہونے والے مسلسل ڈرامائی ڈائیلاگ کی ہے۔ لیلیٰ مجنوں نجد کا آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ سننے والے سمجھتے ہیں کہ ہماری کسی آنے والی مصیبت پر رویا جا رہا ہے حالانکہ عشق و عاشقی میں آہوں اور نالوں کے سوا ہوتا بھی کیا ہے۔ میر و غالب کے عاشق تک یہ نزاکت نہیں سمجھ پاتے۔'' (۲۰)

(iii) ''بہرحال چوپایہ ہے سوتیاڈاہ میں خاصی شہرت رکھتی ہے اسی لئے ایک دوسرے کو ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ اسی لئے جب دو بلّیاں ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو محسوس ہوتا کہ دو حکومتیں لڑ رہی ہیں۔ جنگ عموماً فیصلہ کن ہوتی ہے۔'' (۲۱)

متذکرہ بالا اقتباسات کا بغور مطالعہ کریں تو ان میں انشائیہ کی تمام خصوصیات نظر آتی ہے۔ موضوعات کا تنوع ہے، خیال کی بے ربطی ہے مگر بات میں غیر منطقی ربط موجود ہے، زبان و بیان اور اسلوب کی سادہ کاری ہے جس میں بلّیوں کے وسیلے سے موازنہ اور طنز کا حسبِ ضرورت استعمال کیا گیا ہے مگر طنز کا غالب رجحان نہیں پایا جاتا کہیں کہیں کسی جملے میں موضوع کی مناسبت سے طنز و مزاح پیدا کیا گیا ہے۔ بلّیوں کے عادات و خصائل کو جس طرح پاشا نے دیکھا اور پیش کیا ہے وہ انشائیہ کی فنی نزاکتوں پر پورا اترتا ہے۔ بلّی جیسی غیر اہم چیز کو بھی سماج اور معاشرے سے اس طرح جوڑا ہے کہ انسانی ذہن کو دعوتِ فکر ملتی ہے۔ انشائیہ کی آخری خصوصیات عدم تکمیل یا غیر سالمیت ہے جس کا احساس اس کے آخری پیراگراف سے ہوتا ہے ملاحظہ ہو:

''کھانے یا علاقے پر معاملہ شروع ہوتا ہے۔ لڑاکا ہونے کے باوجود دشمن سے نپٹنے کے بعد بھول جاتی ہیں کہ کبھی لڑی بھی تھیں یا شاید اسی لئے کہ وہ ہر معاملہ سے بروقت براہِ راست نپٹ سکتی ہیں''۔ (۲۲)

اچانک انشائیہ کا ختم ہو جانا اور بات ادھوری رہ جانا جس سے تشنگی یا نامکمل ہونے کا احساس ہوتا ہو، انشائیہ کی اہم خصوصیات ہیں۔ انشائیہ نگار کسی بھی موضوع پر اپنے انداز میں سوچتا ہے وہ جو بات کہنا چاہتا ہے اسکو بڑی چابکدستی سے کہتا چلا جاتا ہے۔ مرکزی بات سے ضمنی باتیں نکلتی چلی جاتی ہیں۔ کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر ہی انشائیہ اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ پاشا نے اپنے بھی انشائیوں میں عدم تکمیل کو مدنظر رکھا ہے۔ ''چیخنا'' کا آخری اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''میں اکثر محسوس کرتا ہوں کہ زندگی کی کامیابی کا راز چیختے رہنے میں ہی ہے چیخنا تو ہمارے لئے ایسا ہی ضروری ہے جیسے کہ زندہ رہنے کیلئے سانس لینا۔'' (۲۳)

پاشا اپنے انشائیوں میں اختصار کے ساتھ بغیر کسی تجسّس اور کھوج کے کسی حقیقت کا اظہار کر دیتے ہیں۔ پاشا اپنے انشائیوں میں کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتے اور نہ ہی کوئی مشورہ دیتے ہیں بلکہ وہ

موضوع کے انوکھے اور تازہ پہلو کی طرف قاری کی توجہ مبذول کراتے ہیں اور اسے مخصوص انداز میں دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں۔ پاشا اپنے انشائیوں میں ایک صاحبِ طرز ادیب کے فرائض انجام دیتے ہیں اور خیال کو بے تکلفی کے ساتھ بیان کرتے ہیں نہ کہ منطقی استدلال کے ساتھ جس سے سرور انبساط کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ پاشا نے جہاں شعوری انشائیہ نگاری کے تحت ''بے ترتیبی'' کو موضوع بنایا وہیں پاشا نے غیر شعوری انشائی دور میں ''ٹائم ٹیبل'' جیسا انشائیہ لکھا ملاحظہ ہو اس کا ایک اقتباس:

''اسکولی'' سے میری مراد میرے اپنے اسکول سے ہے جہاں بیس سال سے وہی پرانا چپراسی گھنٹہ بجاتا ہے جس کی گھڑی کی سوئیاں نقلی ہیں اور وہ دن دھاڑے اونگھتے رہتا ہے۔ اسی سبب اکثر گھنٹہ بھی اونگھ جاتا ہے اور اس کے چونکنے پر کبھی گھنٹہ وقت سے پیشتر اور کبھی بعد میں بجتا ہے۔ جس سے اسکول کا سارا نظامِ اوقات درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اگر لڑکے یا اساتذہ کرام اونگھ جائیں تو کسی کا کچھ نہ جائیگا مگر اس کے اونگھنے سے تو پورا اسکول اونگھ جاتا۔ گھنٹہ تو اسکول کے سب سے ذمہ دار فرد کو بجانا چاہئے جو اسکول کے اعمال و افعال کا جواب دہ ہو اور وہ فردِ واحد سوائے ہیڈ ماسٹر کے اور کون ہو سکتا ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے مدارج پر یہ خوشگوار فرض پرنسپل صاحب، ہیڈ ماسٹر، ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹس یا وائس چانسلر حضرات ہی بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ اس سے اور ہونے والے بے شمار فائدوں کے علاوہ ایک فائدہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اسطرح ایک چپراسی کی تنخواہ بچالیں گے۔ جس کو آجکل فیشن کی اصطلاح میں ''چھوٹی بچت'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور شہرت کا باعث ہو سکتا ہے۔ ''اسکولی'' میں وہ تمام چیزیں آجاتیں ہیں جن کا یادداشت سے براہ راست تعلق ہوا کرتا ہے۔ مثلاً جہاں تک ہم کو اور ہمارے دوستوں کو یاد پڑتا ہے ہمارے اسکول کے شمال میں جو ایک تنگ و تاریک کمرہ ہے جس کے سامنے ''بمبا'' لگا ہوا ہے اور انٹرول میں وہاں دو چار خوانچے والے بھی اپنا سودا فروخت کرنے کے شوق میں جمع ہو جاتے ہیں اور کثرت سے شور ہوتا ہے اور اس شور کے سر پر وہ کمرہ ہے جسے عرفِ عام میں ''اردو کلاس'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسکی پہچان وہ واحد مولوی صاحب ہیں جو صبح سے آکر

پڑھانا، اونگھنا اور لڑکوں کو سزائیں دینا شروع کردیتے ہیں۔" (۲۴)

درج بالا اقتباس میں انشائیہ کی وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو انشائیہ کے لئے ضروری ہیں۔ اس میں موضوع کا تنوع بھی ہے بے بات کی بات یعنی مرکزی بات سے ضمنی بات بھی نکالی گئی ہے، انکشاف ذات بھی ہے، زبان وبیان کی لطافت شگفتگی اور انداز بیان کا انوکھا پن بھی ہے۔ عدم تکمیل یا غیر سالمیت بھی ہے۔ جس میں پاشا نے مختلف موضوعات اور مسائل کی گتھیوں کو سلجھایا ہے اور تاریک گوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے آگے بڑھتے گئے ہیں اور کہیں کہیں جملوں کے الٹ پھیر سے پتے کی بات کہنے کی کوشش بھی کی ہے کہیں بھی سنجیدہ اور منطقی استدلال شامل نہیں کیا ہے۔ اس طرح کی اور بھی تحریریں ہیں جن کا ذکر اس باب کے شروع میں کیا گیا ہے۔ جس میں پاشا نے غیر ارادی انشائی اسلوب اور انشائی خصوصیات کا ذکر کیا ہے مگر ہر انشائیہ سے اقتباس پیش کرنا مشکل ہے۔ سرسری طور پر صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ "کرسی" "جانبداری" "بھولنا" "مونچھیں" اور "ناپسندیدہ لوگ" کا مطالعہ قاری کو بہترین انشائیے کا حظ میسر کرسکتا ہے۔ جس میں انشائیہ کی خصوصیات بکھری ہوئی ہیں۔ پاشا کے کئی انشائیہ نما مضامین ہیں جن کو انہوں نے مضامین کے زمرے میں شامل کر رکھا ہے۔ پاشا نے مصلحتاً ایسا کیا ہے کیونکہ ان کا کوئی بھی مجموعہ خالص انشائیوں کا مجموعہ نہیں ہے۔ پاشا انشائیہ کے فنی محاسن سے واقف تھے مگر انشائیہ کے فن سے بحث کرتے ہوئے ان کے اندر بھی اندھی تقلید اور جانبداری کے جذبے نے سر ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے پاشا کے اس مضمون میں تھوڑی سی ملاوٹ معلوم ہونے لگی اور دلائل میں کمی رہی اسلئے ان کے ان مضامین کو ہم اگر اسی پس منظر میں دیکھیں تو یہ انشائیہ ہیں مگر مصلحتاً مضمون کے زمرے میں شامل ہیں۔ پاشا نے ہمیشہ انشائیہ نگاری کے تیز دھارے پر تیرنے کی کوشش کی ہے اور انشائیہ کی تخلیق میں انہوں نے ہمیشہ انوکھا پن اور نرالا انداز اپنایا ہے۔ انہوں نے بہت کم گنے چنے موضوعات پر انشائیہ لکھا مگر ان میں بھی ان کے چند انشائیے کے موضوعات ہو بہو دوسرے انشائیہ نگاروں کے موضوعات سے ملتے ہیں مثلاً "چیخنا" کو وزیر آغا نے بھی انشائیہ کا موضوع بنایا ہے اور پاشا نے بھی "چیخنا" پر انشائیہ لکھا ہے اگر آپ دونوں انشائیوں کا مطالعہ کریں تو یہ اندازہ ہوگا کہ پاشا کے اسلوب میں فطری پن ہے انہوں نے چیخنا کی مختلف وضاحتیں بڑے ہی عمدہ ڈھنگ سے کی ہیں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ پاشا نے بڑے ہی اچھے انداز میں چیخنا ہے لیکن وزیر آغا نے کہیں بھی چیخا نہیں ہے بلکہ چیخنے کو موضوع بنایا اور چیخ یا چیخوں سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اسلوب میں اجنبیت اور آورد کا احساس ہوتا ہے۔ پاشا نے

انشائیہ کا موضوع ہجرت بنایا جبکہ اس سے قبل وزیر آغا ہجرت کے موضوع پر انشائیہ لکھ چکے تھے جو ان کے مجموعہ "دوسرا کنارہ" میں شامل ہے مگر پاشا کے انشائی اسلوب کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نقشِ ثانی نقش اول سے بہتر ہے۔ پاشا کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اس موضوع کو بھی اپنے انشائیے کا موضوع بناتے ہیں جس کو ان کے قبل کسی نے موضوع بنایا ہے مگر اسلوب کی تخلیقی قوت کی بنیاد پر وہ موضوع میں نیا پن پیدا کردیتے ہیں جس سے کسی نئے گوشے کا اضافہ بھی ہوتا ہے اور موازنہ میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ انور سدید نے "مونچھیں" کو اپنا موضوع بنایا۔ پاشا نے بھی "مونچھیں" پر انشائیہ لکھا۔ دونوں میں ذہنی سطح پر کافی یکسانیت ہے۔ انور سدید نے لمبی مونچھ کو زوال پذیر معاشرہ کا چلن بنایا ہے۔ پاشا نے بھی زوال پذیر معاشرہ کا ذکر کیا ہے ملاحظہ فرمائیں:

"شیر مار کہ مونچھ ہر کس و ناکس کے بس کی چیز نہیں یہ بادشاہ لوگوں کی چیز تھی۔ مونچھ کیا ہوتی تھی حکومتوں کے عروج وزوال کا نقشہ ہوتی تھی۔" (۲۵)

اس کے علاوہ بھی نظیر صدیقی کا "بور" اور پاشا کا "بور" وزیر آغا کا "بے ترتیبی" اور پاشا کا "بے ترتیبی" قابلِ ذکر ہیں جن سے پاشا کے اسلوب، زبان وبیان، موضوعات کے تنوع کا موازنہ دوسرے انشائیہ نگاروں سے بہ آسانی کیا جاسکتا ہے پاشا نے وزیر آغا سے انشائیہ کا فیضان حاصل کیا ان کی تقلید کی اور یہاں تک کہ انکے ارادی انشائیوں میں تین عدد انشائیے موضوع کے اعتبار سے وزیر آغا سے مماثلت اور یکسانیت رکھتے ہیں مثلاً ہجرت، "بے ترتیبی" اور "چیخنا" مگر پاشا اپنے فنی پختگی، لفظی اختصار، موضوع میں سرور انبساط اور غیر منطقی ربط میں یا اپنی ذات کا لمس عطا کر کے وزیر آغا پر سبقت حاصل کرلیتے ہیں۔ جہاں پاشا کی تحریروں میں فطری پن ہے۔ وہیں وزیر آغا کی تحریر قصداً اور ارادتاً نوکِ قلم تک لائی معلوم ہوتی ہے۔ جن میں غیر فطری پن اور بوجھل پن ہے یہ اپنے ماحول اور سماج سے کنارہ کشی کا نمونہ اور تخیل کی بلند پروازی ہے نہ کہ انشاپردازی جبکہ انشائیہ میں انشاء بھی ایک وصف ہے۔

پاشا کے بیش تر انشائیوں میں اس دور اور لمحے کی چاپ سنائی پڑتی ہے جس دور میں وہ تخلیق کئے گئے ہیں۔ پاشا نے عصری آگہی کو مختلف زاویوں سے پیش کرنے کی کوشش کی جس میں اس عہد کی سماجی کشمکش اور معاشرتی کروٹوں پر ایک حساس نظر ڈال کر عصری حقیقتوں کو نئے نئے زاویوں سے اجاگر کیا ہے۔ مثال کے طور پر انکا انشائیہ "چیخنا" جس میں پاشا نے اس دور کی احتجاجی روش کو اجاگر کیا ہے اور سرکار عوام اور معاشرے کی بے حسی کو دکھایا ہے۔ انسانی خود غرضی کو منظر عام پر لانے کی

کوشش کی ہے۔ انشائیہ ''ہجرت'' میں پاشا نے مکان کے مسئلے کو اٹھایا ہے۔ روٹی روزی کے مسئلے کو اٹھایا اور فکر معاش میں بیرون ملک جا کر نوکری کرنے والوں کی بے چینی کو اس کے تمام پہلوؤں کو ہجرت کے آڑ میں پیش کیا ہے جس میں دور حاضر کی پریشانیوں، دشواریوں اور مسائل کی عکاسی ہوتی ہے جسے ہم عصری آگہی کہہ سکتے ہیں جس عہد میں پاشا نے انشائیہ تخلیق کیا ہے اس دور میں ہجرت کا مسئلہ زیر غور تھا۔ اسلئے انکے انشائیوں میں اس دور کا سماج پنہاں معلوم ہوتا ہے یوں تو تقریباً ہر زمانے کا ادب اپنے سماج کا آئینہ ہوتا ہے اور ہر ادیب اس کا آئینہ دار، مگر معدود چند ادیب ایسے ہیں جن کی تحریر میں ان کا عہد کروٹیں لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ پاشا بھی ان میں سے ایک ہیں۔ پاشا کا انشائیہ ''شور'' آج کے اس مشینی دور اور سائنسی زمانے کی پیداوار ہے جہاں مختلف طرح کے شور شرابے ہیں۔ محکمۂ ماحولیات نے ساؤنڈ پولوشن کی بات کی پاشا نے انشائیہ شور لکھا جس میں عصری آگہی سو فیصد موجود ہے۔ خواہ کوئی بھی ادب ہو اس میں عصری آگہی کا دارمدار اس کے تخلیق کار پر ہے کہ وہ کس ماحول اور سماج کی پیداوار ہے، کس ذہنیت کا مالک ہے۔ اس کی عملی زندگی کیسی ہے ادب کی دوسری صنف میں ادیب کی شخصیت کا عمل دخل اسکی تخلیق پر براہ راست نہیں ہوتا ہے لیکن انشائیہ میں انشائیہ نگار کے شخصیت کی جھلک یا انکشاف ذات ہوتا ہے اسلئے انشائیہ میں انشائیہ نگار کو عالم باعمل ہونا چاہیے۔ ادب میں اگر حقیقت کا پرتو ہے تو عصری آگہی لازمی ہے۔

پاشا عملی زندگی میں سماج، معاشرے اور اپنے آس پاس کے نشیب و فراز سے واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کے موضوعات اسی سماج سے کشید کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ سماج کے فعّال عہدیدار ہیں جس میں سماج جلوہ گر ہے۔ یہ خود بھی سماج پر اپنے اثرات ثبت کرتے ہیں اور سماج بھی ان پر اپنے اثرات مرتب کرتا ہے۔ اسلئے پاشا کے انشائیوں میں سماجی اور عصری آگہی جا بجا دکھائی دیتی ہے۔

انشائیہ میں ہیئت اور تکنیک کی پابندی نہیں ہوتی انشائیہ میں انشائیہ نگار آزاد ہوتا ہے وہ اسلوب بیان میں اپنے کسی بھی حربے کو استعمال کر سکتا ہے اور انشائیہ میں جان ڈال سکتا ہے۔ پاشا نے اپنے انشائیوں میں موازنہ سے دم خم پیدا کیا ہے جس سے ان کی انفرادی شناخت بھی قائم رہتی ہے اور انشائیہ میں فنی حسن بھی پیدا ہو جاتا ہے موازنہ سے وہ موضوع کے تہہ میں غوطہ لگاتے ہیں اور قیمتی موتی نکالتے ہیں۔ موازنہ میں وہ دو بے میل چیزوں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ہم زاد بن جاتے ہیں۔ خواہ چیزیں مرئی ہوں یا غیر مرئی ہی کیوں نہ ہوں ان کے خیال

میں ایسی ندرت پائی جاتی ہے کہ وہ الفاظ کا جادو جگا کر قاری پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتے ہیں۔ اسلوب نگارش اور طرز بیان ہی انشائیہ کی اصل روح ہے اور پاشا کو بے جان لفظوں میں روح پھونکنے کا ہنر آتا ہے۔ مثلاً ''ہجرت'' ہجرت میں سائنسدانوں کے چاند پر جانے کی ریسرچ اور ستاروں کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کو جنّت کا شارٹ کٹ راستہ تلاش کرنے سے موازنہ کرتے ہیں۔ جب کہ یہ صرف تخیّل اور قیاس کی کارفرمائی کے سوا کچھ نہیں۔ ''بلّیوں کے سلسلے'' میں انہوں نے بلّی کا موازنہ جوگی اور بھکاری سے اس طرح کیا ہے کہ حرکت و عمل، اوصاف و خصائل میں یہ بھی ایک جیسے ہیں جب کہ جوگی انسان اور بلّی جانور ہے مگر وہ بھی کو سماجی جانور مانتے ہیں۔ جس سے کافی مماثلت پیدا کر دیتے ہیں۔ انشائیہ ''بور'' میں انسانی زندگی کی تکرار اور بوریت کو گراموفون کے ریکارڈ پر پھنسی سوئی سے موازنہ کرتے ہیں لکھتے ہیں کہ جب زندگی کے ریکارڈ کی سوئی پھنس جائے تو اسے اٹھا کر موضوع بدل دینا چاہئے تا کہ روزانہ کی تکرار ختم ہو جائے اور زندگی بور سے آزاد ہو جائے۔

انشائیہ شور میں شور کا موازنہ کسی مردانہ مرد مجاہد اور غازی صف شکن سے کرایا ہے جیسے غازی یا صف شکن میدان جنگ میں مردانہ وار طبلِ جنگ بجاتا ہوا آگے بڑھتا ہے ٹھیک ویسے ہی شور بھی مردانہ وار بڑھتا ہے۔ انشائیہ چیخنا میں چیخنے کا موازنہ ایوانوں اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کی سرگرمیوں سے چیخوں سے کرایا ہے جو کافی حد تک موزوں بھی ہے اور فطری بھی۔

پاشا کے تمام انشائیوں میں موازنہ کہیں نہ کہیں ضرور دکھائی دیتا ہے جس سے موضوعات کی رنگا رنگی میں اضافہ ہوتا ہے آزاد خیالی یا آوارہ خرامی سے تخلیقی اسلوب، جدّتِ فکر اور رعنائی خیال کا احساس ہوتا ہے۔ حسب ضرورت انشائیہ نگار اس سے فن میں نکھار اور پختگی پیدا کرتا ہے۔ پاشا کے انشائیوں میں عصری آگہی ہوتی ہے وہ زندگی سے مربوط ہوتا ہے ان کے انشائیے نے عام انسان کو زندگی پر غور و فکر کرنے کے لئے نئے نئے زاویے عطا کئے۔ آج کے اس مشینی دور میں جہاں انسانی عقل ایک طرف دنیا کی ترقی دیکھ کر حیران ہے تو دوسری طرف انسانی بے چارگی کو دیکھ کر پریشان بھی ہے، جس سے فرد، سماج اور معاشرے میں، بے حسی، حیرت و استعجاب کی کیفیت طاری ہوتی جارہی ہے۔ پاشا کا انشائیہ معاشرے کے تھکے ہارے، مایوس اور بیزار انسانوں کی معمول زندگی میں مسرّت انگیز نئے پہلو دکھاتا ہے تا کہ اس کے اندر کی بوریت اور یکسانیت و تکرار کے عمل میں خلل پیدا کر کے اسکے اندر زندگی سے محبت پیدا کر سکے اور زندگی جینے کا سلیقہ سکھا سکے تا کہ اس سے انسان کی عظمت اور

زندگی کا وقار بلند ہو سکے۔ انشائیہ انسان کو سرور و انبساط کے ساتھ زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ جس سے سماج و معاشرے میں پھیلی بدعنوانیاں مثلاً نفرت، مفلسی، اور بے چارگی دور ہو سکے اور زندگی میں خوشیوں کی نئی کرن بکھرتی دکھائی دے۔ زندگی کو انفرادی اور اجتماعی طور پر عزم و حوصلے کے ساتھ جینے کی ترغیب پاشا کے انشائیوں سے ملتی ہے۔ انشائیہ کا کام تکرار اور یکسانیت کے جمود کو توڑنا اور نئے گوشوں کو منور کرنا، زندگی کو نیا زاویہ اور غور و فکر کا نیا انداز عطا کرنا ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاشا کے انشائیوں میں زندگی کی رنگارنگی بھی ہے اور اسلوب کی تازگی و شگفتگی بھی، خیالات کی بے ربطی بھی ہے اور موضوعات کا تنوع بھی، غیر منطقی ربط بھی ہے اور عدم تکمیل کا احساس بھی جو ہمیں دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں اور زندگی کے مدار سے بلند کر کے ہمیں زندگی کی حقیقتوں سے آشنا بھی کراتے ہیں۔ اسکے تاریک گوشوں کو منور کر کے ہمیں اسکی تہہ تک لے جاتے ہیں ان کے انشائیوں میں ایجاز واختصار ہے اور انداز بیان میں جادو ہے۔ پاشا کے انشائیوں میں سماجی نشیب وفراز کی حقیقت بیانی بھی ہے اور زندگی کا حسن بھی ہے، تخلیقی اسلوب سے زبان وبیان میں سادگی اور اسلوب میں فطری پن جھلکتا ہے۔ الفاظ کی سلیقہ مندی سے قاری پر گرفت مضبوط ہے اور تجسس وخیال آفرینی کے ساتھ ساتھ سرور انبساط اور مسرت کی بھی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جس سے قاری کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس کے در پردہ ایک جہانِ معنی اور الفاظ کا بیکراں سمندر ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی

۱ معلم اردو، لکھنؤ، جنوری ۱۹۸۸ء — ۱۰۸
۲ انشائیہ کے خدوخال، ڈاکٹر وزیر آغا، مکتبۂ فکر وخیال، لاہور ۱۹۹۰ء — ۸۳
۳ کتاب نما، نئی دہلی، نومبر ۱۹۸۳ء — ۴۲
۴ ستم ایجاد، احمد جمال پاشا، کتاب پبلشرز، چوک لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۶۶ء — ۲۳۵
۵ کتاب نما، نئی دہلی، نومبر ۱۹۸۹ء — ۱۰۰
۶ زبان وادب، پٹنہ، اپریل تا جون ۱۹۸۴ء — ۱۲۵
۷ آج کل، نئی دلی، جون ۱۹۸۳ء — ۴۱
۸ آج کل، نئی دلی، جون ۱۹۸۴ء — ۴۰
۹ شاعر، بمبئی، مئی ۱۹۸۳ء — ۵۷
۱۰ انشائیہ کے خدوخال، ڈاکٹر وزیر آغا، مکتبۂ فکر وخیال، لاہور، ۱۹۹۰ء — ۹۷
۱۱ زبان وادب، پٹنہ، اپریل تا جون ۱۹۸۴ء — ۱۲۶
۱۲ شاعر، بمبئی، مئی ۱۹۸۳ء — ۵۷
۱۳ شاعر، بمبئی، مئی ۱۹۸۳ء — ۵۷
۱۴ اردو، پنچ، راولپنڈی، شمارہ ۱۹۸۴ء — ۵۶
۱۵ شاعر، بمبئی، مئی ۱۹۸۳ء — ۶۲
۱۶ زبان وادب، پٹنہ، اپریل تا جون ۱۹۸۴ء — ۱۲۴
۱۷ آج کل، نئی دلی، جون ۱۹۸۴ء — ۴۱
۱۸ آج کل، نئی دلی، جون ۱۹۸۳ء — ۴۰

۱۹	اوراق، لاہور، ستمبر، ۱۹۸۱ء	۲۲۴
۲۰	اوراق، لاہور، ستمبر، ۱۹۸۱ء	۲۲۵
۲۱	اوراق، لاہور، ستمبر، ۱۹۸۱ء	۲۲۶
۲۲	اوراق، لاہور، ستمبر، ۱۹۸۱ء	۲۲۶
۲۳	شاعر، بمبئی، مئی ۱۹۸۳ء	۶۲
۲۴	اندیشہ شہر، احمد جمال پاشا، نیچ پبلشرز امین آباد، لکھنؤ ۱۹۶۵ء	۱۲۸
۲۵	ستم ایجاد، احمد جمال پاشا، کتاب پبلشرز، چوک لکھنؤ اکتوبر ۱۹۶۶ء	۲۳۸

پانچواں باب

ماحصل

ماحصل

اس کتاب کے گزشتہ چار ابواب میں احمد جمال پاشا کی انشائیہ نگاری کے حوالے سے بہ حیثیت انشائیہ نگار انکی ادبی شخصیت متعین کرنے کی کوشش کی گئی اوران کی پہلودار شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر قدرے تفصیل سے بحث کی گئی ہے تا کہ ان مرکبات کی شناخت ہو سکے جن کا مجموعہ پاشا کی ادبی شخصیت ہے۔ پاشا کی ادبی شخصیت کا مکمل عرصہ ۳۷ رسال پر محیط ہے۔ ان کی ادبی شخصیت کو لکھنؤ کی ادبی فضا سے تحریک ملی اور اساتذہ، دوست واحباب سے انہوں نے ادبی فیضان حاصل کیا۔ دورانِ طالب علمی لکھنا شروع کیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بحیثیت طالب علم اقامت گزیں رہے۔ جہاں ان کی ادبی شخصیت میں تراش وخراش، سنجیدگی (ادبی سنجیدگی یعنی مزاح میں سنجیدگی کے ساتھ دلچسپی لینا) بانکپن اور نکھار آیا جو ان کی شخصیت سے صاف طور پر منعکس ہوتا تھا۔ نفاست اور سلیقہ مندی یوں تو لکھنؤ کا خاصہ رہا ہے مگر علی گڑھ آنے کے بعد ان میں ضابطگی اور ٹھہراؤ پیدا ہوا جس سے وہ ادیب کی صف میں شامل ہو گئے۔ علی گڑھ کی ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور اپنے گرد وپیش کے ماحول میں قلمی دخل اندازی کرتے رہے۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران سر سید ہال کا مجلّہ ''پیروڈی نمبر'' مرتب کیا جس میں ان کی دو پیروڈیاں شامل ہیں جس میں '' کپورا ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' کو عالمی شہرت حاصل ہوئی جو ان کی شناخت کا محرک بنا۔ تعلیم مکمل کر کے پاشا نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی اور روز نامہ'' قومی آواز'' لکھنؤ میں ملازمت کر لی۔ جہاں سے ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا۔ بطور صحافی ایک سرگرم ادیب بھی ثابت ہوئے۔ پندرہ برس کی صحافتی زندگی کے درمیان ہی ادب میں بیش قیمت اور گراں قدر اضافے کئے۔ مختلف مضامین کے مجموعے شائع

کرائے۔ چند کتابیں بھی ترتیب دیں اور بذاتِ خود "اودھ پنچ" جیسے مزاحیہ اخبار کی ادارت اور ملکیت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے مگر اخبار نکالنا کافی مشکل کام ہے۔ مالی واقتصادی دشواریوں کے سبب اخبار بند ہوگیا۔ پھر انہوں نے لکھنؤ کو خیر آباد کہا اور سیوان میں بہ حیثیت لکچرر درس وتدریس سے جڑ گئے اور تا حیات یہ فرائض انجام دیتے رہے پاشا کی پہلودار شخصیت میں جہاں ان کی مختلف ادبی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں ان کی مستقل مزاجی پر شک بھی ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ نئی نئی پگڈنڈیوں کی تلاش میں رہتے زندگی کو ایک چیلنج سمجھ کر اس سے ہمیشہ نبرد آزما رہے جس سے ان کے احتجاجی اور اختراعی ذہن کا پتہ چلتا ہے۔ پاشا کی ادبی شناخت کے مختلف پہلو ہیں وہ بحیثیت طنز ومزاح نگار مشہور ہوئے۔ ابتدائی زمانہ سے ہی بچوں کے ادیب بھی رہے۔ عملی زندگی بطور صحافی شروع کی۔ بعد میں اشاعتی ادارہ پنچ پبلیشرز کی شروعات کی جو بعد میں بند ہوگیا۔ طنز ومزاح کی تحقیق وتنقید میں کافی سرگرم رہے۔ کئی کتابوں کے مصنف ومرتب رہے۔ پاشا نے چند تحریروں کی بناء پر ہی ادبی شناخت بہ حیثیت پیروڈی نگار بھی بنالی۔ الفاظ اور زبان وبیان کی جہاں نقالی کی وہیں لفظوں سے کئی ادیبوں کی لفظی تصویر بھی بنائی جسے ادب میں خاکہ کہتے ہیں اور اس لفظی تصویر کی بنیاد پر انھیں خاکہ نگار کی حیثیت سے بھی جانا جانے لگا۔ پاشا کو زبان وبیان پر قدرت حاصل تھی جس کا بھرپور استعمال انہوں نے اپنی ادبی زندگی میں کیا۔ آخر میں بطور انشائیہ نگار بھی جانے اور پہچانے جانے لگے۔ وہ تمام عمر زبان کا مزہ بدلتے رہے اور غیر افسانوی خطے میں چہل قدمی کرتے رہے۔ انہوں نے لطیفہ پر باضابطہ مضمون لکھے اور اس کی ادبی حیثیت متعین کرنے کی بھی سعی کی۔ لطیفہ گوئی ان کا محبوب مشغلہ تھا مگر زندگی کے آخری دور میں تحقیق وتنقید اور انشائیہ نگاری پر خصوصی توجہ دی اور ہندوستان میں انشائیہ نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔

اردو انشائیہ نگاری کی بحث میں پاشا بھی گاہے بگاہے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے۔ اردو انشائیہ نگاری کی تنقید وتحقیق میں وہ کچھ جانبدار نظر آتے ہیں۔ ہندوستان میں اردو انشائیہ نگاری کا سرچشمہ پاکستان کی انشائیہ نگاری کو قرار دیتے ہیں اور اردو انشائیہ کی بحث میں وزیر آغا کی پیروی کرتے دکھائی دیتے ہیں جب کہ اس کتاب کے پہلے باب "اردو انشائیہ نگاری ایک تجزیہ" تحریر کرنے کے بعد میرے ذہن میں جو خیالات ابھرتے ہیں وہ یہ کہ اردو انشائیہ نگاری کی شروعات غیر ارادی اور لاشعوری طور پر اردو ادب میں سرسید کے دور سے ہوئی جب کہ انشائیہ نما تحریر اور انشائیہ کے تیور اور اس کی چند خصوصیات اردو نثر کے ابتدائی دور یعنی ملا وجہی کے "سب رس" میں بھی موجود تھیں

انشائیہ کی چند خصوصیات ہر دور اور ہر عہد کی اردو نثر میں کم وبیش موجود ہیں خواہ وہ میر امن کی "باغ وبہار" ہو یا "غالب کے خطوط" عہد سرسید کے مضامین ہو یا بیسویں صدی کے انشائیہ نما مضامین، تمام اصناف نثر میں انشائیہ کی چنندہ خصوصیات جلوہ گر ہیں۔ سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد اور خواجہ حسن نظامی کے یہاں انشائے لطیف، شگفتہ اور ہلکی پھلکی طرز تحریر میں بھی انشائیہ جلوہ افروز تھا مگر انشائیہ کی اصطلاح بعد میں عام ہوئی۔ انشائیہ کا رجحان اور انشائیہ کا اسلوب بیسویں صدی میں غالب تھا مگر انشائیہ کی اصطلاح بعد میں رائج ہوئی۔ لفظ انشائیہ کی شروعات اختر اورینوی نے کی جنھوں نے سید علی اکبر قاصد کے انشائیوں کے مجموعہ "ترنگ" پر ایک بصیرت آموز مقدمہ لکھا۔ پہلی بار لفظ "انشائیہ" کو ہلکے پھلکے غیر سنجیدہ بے ربط اور شگفتہ طرز تحریر کے لئے مخصوص کیا۔ انشائیہ کی اصطلاح اور انشائیہ کی خصوصیات کا ذکر دیگر رسائل میں بھی بہ شکل مضمون کرتے رہے جس کا تفصیل سے ذکر اس کتاب کے پہلے باب میں کیا جا چکا ہے۔ اختر اورینوی نے لفظ انشائیہ کی شروعات کی، انشائیہ کی اصطلاح رائج کی اور انشائیہ کی خصوصیات بھی واضح کیں۔ ساتھ ہی ساتھ انشائیہ کی نشاندہی بھی کی اور انشائیوں کا پہلا مجموعہ "ترنگ" قاری کی عدالت میں پیش کیا۔ جس کو ادبی حلقوں میں قبولیت کی سند بھی ملی۔ اس طرح انشائیہ کا شعوری سفر چل نکلا مگر اس بنیاد پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے بعد بھی ہندوستان میں انشائیہ کا وجود سرے سے تھا ہی نہیں بلکہ جس تحریر کو اختر اورینوی نے انشائیہ کے طور پر پیش کیا اور جن خصوصیات کو انشائیہ کی اصطلاح کے لئے مخصوص کیا ان کی جملہ خصوصیات اس سے قبل کی تحریروں میں دیکھنے کو ملتی ہیں جس کی نشاندہی برابر کی جاتی رہی ہے مثالیں بھی پیش کی جاتی رہی ہیں اس لئے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اختر اورینوی کی روایت کو سید محمد حسنین عظیم آبادی نے صنف انشائیہ اور انشائیے" لکھ کر آگے بڑھایا جس میں انشائیہ کے فن پر ایک طویل مقدمہ بھی شامل ہے۔ اس میں انشائیہ کو طنز ومزاح اور مضمون کی دیگر صنفوں سے الگ باضابطہ ایک صنف کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ یہ کتاب ۱۹۵۸ء میں پہلی بار منظر عام پر آئی یعنی آزادی کے قبل ہی ہندوستان میں اردو انشائیہ کی شروعات ہو چکی تھی اور حسنین عظیم آبادی کی کتاب بھی آزادی کے بعد منظر عام پر آ چکی تھی مگر ان سب کو نظر انداز کر کے اور محض ایک اتفاقیہ بحث قرار دیکر ڈاکٹر وزیر آغا اور ان کے اوراق گروپ نے اردو انشائیہ کو پاکستان میں پیدا کیا یعنی انشائیہ کا پنر جنم بھی نہیں ہوا بلکہ از سر نو ابتداء پاکستان سے ہوئی اور وزیر آغا اردو انشائیہ کے خود ساختہ موجد بھی کہلائے جانے لگے۔ جس کی تائید پاکستان کے چند انشائیہ نگاروں نے کی۔ ساتھ ہی ساتھ اس پر پاکستان میں

اعتراض بھی کیا گیا جس کی تصدیق ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب ''انشائیہ کی بنیاد'' سے ہو جاتی ہے مگر ڈاکٹر وزیر آغا اور ان کے گروپ نے اردو انشائیہ پر اپنی مہر ثبت کر کے اسے اپنے نرغے میں لے لیا۔ انشائیہ کے فنی محاسن کی نشاندہی وہ اپنے فریم کے مطابق کرنے لگے اور ہندوستان میں لکھی گئی تحریروں کو انشائیہ کے قریب یعنی انشائیہ نما قرار دیا۔ جب کہ ادب اپنے ماحول اور سماج کا آئینہ ہوتا ہے جو اپنے گرد و پیش سے مواد کشید کرتا ہے اور ادیب اسے اپنے اسلوب بیان کے ذریعہ صنفی پیکر عطا کرتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کا سماج جدا ہے تہذیبیں جداگانہ ہیں۔ ماحول الگ الگ ہے مسائل بھی الگ ہیں اور فنی تقاضے بھی جدا جدا ہیں۔ اس لئے ہندوستان اور پاکستان کے ادب میں موضوعاتی طور پر تھوڑا بہت فرق لازمی ہے۔ ہندوستان میں تہذیبی تکثیریت ہے یہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں مختلف تہذیب اور مشترکہ تہذیب کی پیروی کرنے والے لوگ رہتے ہیں جس کی ایک قدیم تاریخ ہے مختلف زبانوں کے بولنے والے موجود ہیں، مختلف انداز سے زندگی بسر کرنے والے موجود ہیں اس لئے یہاں کی تخلیق میں بھی اس کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ جس کی بنیاد پر ہمیں ہندوستانی ادب کو ہندوستانی پس منظر میں دیکھنا ہوگا۔ اردو انشائیہ کے ابتدائی نقوش ''نثر کے ابتدائی دور سے ملتے ہیں انشائیہ کی نامزدگی کے بعد باضابطہ طور پر انشائیہ کی مثالیں ملتی ہیں جس میں ''ترنگ'' کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اردو انشائیہ نگاری کی باضابطہ روایت ترنگ کے بعد شروع ہوئی جسے پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، کنہیالال کپور، کرشن چندر، مرزا محمود بیگ، سید ضمیر دہلوی، حسنین عظیم آبادی، فکر تونسوی، یوسف ناظم ڈاکٹر جاوید وششٹ، رام لعل نابھوی، اور مجتبیٰ حسین وغیرہ نے پائیداری عطا کی تمام ادیبوں اور نقادوں نے اپنے ادبی سفر کی شروعات دوسری صنفوں سے کی بعد میں اردو انشائیہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ جس میں حسنین عظیم آبادی، ڈاکٹر جاوید وششٹ رام لعل نابھوی اور احمد جمال پاشا کی حیثیت خالص انشائیہ نگار کی ہے جنہوں نے انشائیہ نگاری کی طرف مراجعت کی اور جب انشائیہ تخلیق کیا تو اس میں تخلیقی اسلوب سے قاری کو سرور وانبساط اور مسرت بہم پہنچانے کی کوشش کی جب کہ طنز و مزاح ہنسنے ہنسانے کیلئے عام حربہ تھا لیکن انشائیہ میں کہیں کہیں حسب ضرورت اس کا استعمال کیا گیا ہے اور صرف الفاظ کی بازیگری اور اسلوب کی تازگی، شگفتگی اور انوکھے پن سے قاری پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ ان کے علاوہ بھی کئی انشائیہ نگاروں نے گاہے بہ گاہے انشائیہ کے چمن میں گل بوٹے کھلائے اور انشائیہ کے چمن کو زعفران زار کیا ہے لیکن بالخصوص احمد جمال پاشا تک انشائیہ کی روایت کو قائم رکھنے میں متذکرہ بالا انشائیہ نگاروں کا

ذکر تفصیل سے ضروری تھا جس کے تحت معاصرین پاشا کے اسلوب اور تخلیقات کا ایک سرسری جائزہ لیا گیا۔ تاکہ چھپے ہوئے انشائیہ نگاروں کو منظر عام پر لا کر ان کے انشائیوں سے احمد جمال پاشا کے انشائیوں کا موازنہ کیا جاسکے اور یہ اندازہ لگایا جاسکے کے پاشا اپنے ہمعصروں کے شانہ بہ شانہ چلنے میں کہاں تک کامیاب رہے۔ پاشا کے معاصرین کی ادبی حیثیت کا اندازہ صرف چند سطور اور چند صفحات میں سرسری طور پر لگانا مشکل ہے بلکہ اس کے لئے باضابطہ طور پر ایک طویل مقالہ درپیش ہے اس لئے ان کے فن پر بالغ النظری سے کام لیکر ان کے فنی اوصاف کشید کئے گئے ہیں اور انہیں بطور انشائیہ نگار دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔ احمد جمال پاشا کے انشائیوں کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کے بعد چند باتیں جو سرسری طور پر سامنے آئی ہیں وہ یہ کہ پاشا اپنے تمام معاصرین سے قدرے مشترک بھی ہیں اور منفرد بھی۔ پاشا نے اپنے انشائیوں کو تخلیق کرتے وقت اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا کہ انشائیہ اسلوب کی کارفرمائی کا نتیجہ ہے اور حسب ضرورت اس میں انشائیہ نگار دوسری چیزوں کو شامل کر سکتا ہے۔ پاشا نے اپنے انشائیوں میں طنز و مزاح اور عصری آگہی کا خاص خیال رکھا ہے۔ کہیں بھی ان کا استعمال بے محل نہیں معلوم ہوتا بلکہ طنز ہو یا موازنہ انہوں نے اپنے اسلوب کی پختگی اور زبان و بیان کی چابکدستی سے اس میں ایک خاص سلیقہ مندی پیدا کر دی ہے جس سے ان کے انشائیے فنی میزان پر کھرے اترتے ہیں۔ وہ الفاظ کی ظاہری سلیقہ مندی سے بخوبی واقف ہیں۔ انشائیہ کی غیر سنجیدگی اور بے ربطی سے بھی وہ باطنی طور پر واقف ہیں۔ وہ انشائیوں میں موضوعات کے انتخاب، رنگا رنگی، انوکھے پن، موضوعات کے تنوع اور تازگی کا خاص خیال رکھتے ہیں جس میں وہ اپنی شخصیت کو شامل کر کے اپنی تحریر کو انشائیہ بنا دیتے ہیں۔ پاشا ایک کامیاب انشائیہ نگار ہیں جنہیں زبان و بیان اور اسلوب بیان پر قدرت حاصل ہے۔ انہوں نے ایک ہی دور میں انشائیہ بھی تخلیق کیا اور طنز و مزاح سے بھی وابستہ رہے۔ دونوں میں کہیں بھی فنی حق تلفی نہیں کرتے بلکہ وہ ہمیشہ ایک عادل اور منصف کے فرائض انجام دیتے اور دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ الگ کر کے قاری کے سامنے دو صنفوں میں انشائیہ اور طنز و مزاح کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کو پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن میں سوالیہ نشان بھی ابھرتے ہیں اور اس کے ذہن کی مختلف گتھیاں سلجھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ پاشا نے اپنی طرز نگارش اور اسلوب بیان کا خوب فائدہ اٹھایا اور دل کھول کر مضامین و انشائیے لکھے ہیں کہیں بھی وہ (خواہ طنز و مزاح ہو یا انشائیہ) ڈگمگاتے نہیں ہیں بلکہ انشائیے کے پل صراط سے وہ بہ آسانی گزر کر اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتے ایک ہی موضوع پر انشائیہ اور مضمون دونوں لکھ

کر اس کی صاف صاف وضاحت کردی ہے کہ انشائیہ اور طنزیہ ومزاحیہ مضمون میں کیا فرق ہے۔ یہ فرق ان کے انشائیہ "بور" میں واضح طور پر دکھائی دیتا ہیں جب کہ اس کے کافی عرصہ قبل "بور کی قسمیں" پر طنزیہ ومزاحیہ مضمون لکھ چکے ہیں۔ دونوں کو پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن میں پاشا کی انشائیہ نگاری کا واضح تصور سامنے آجائے گا۔ پاشا نے اکثر وبیشتر انشائیے کے موضوع کیلئے انہیں کا انتخاب کیا ہے جس موضوع پر پہلے پاکستان میں انشائیے لکھے جاچکے ہیں اور بالخصوص وزیر آغا نے جسے موضوع بنایا ہے۔ مثلاً "ہجرت" "بے ترتیبی" اور "چیخنا" یہ تینوں خشک اور بے جان موضوعات ہیں جن پر کچھ لکھنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے مگر پاشا نے ان موضوعات میں اپنے اسلوب نگارش سے جان ڈال دی ہے جس کے مطالعے سے قاری کو صرف مسرت کا احساس ہی نہیں ہوتا بلکہ اسے دعوتِ فکر بھی ملتی ہے۔ انکشافِ ذات ہو یا غیر منطقی ربط، مرکزی بات سے ضمنی بات پیدا کرنا ہو یا موضوع کا تنوع، ہر اعتبار سے پاشا کے انشائیوں میں وزیر آغا سے بہتر تخلیقی اسلوب کارفرما ہیں۔ اس کے علاوہ انور سدید اور نظیر صدیقی کے موضوعات بھی پاشا کے انشائیوں سے ملتے ہیں مگر پاشا اپنی انفرادیت کا احساس دلاتے رہتے ہیں پاشا کی ادبی دوستی طالب علمی کے دور سے ہی دکھائی دیتی ہے۔ پاشا ادب کی بے راہ روی، ادب میں پھیلی بدعنوانیوں سے ہمیشہ نبرد آزما دکھائی دیتے ہیں اور اس کی اصلاح وہ اپنے تحریری اسلوب یا تخلیقات کے ذریعہ کرتے رہے ہیں۔ مضمون یا انشائیہ تخلیق کرکے علمی ترغیب دیتے رہے ہیں۔ وزیر آغا کے وہ تمام موضوعات جن پر پاشا نے از سرِ نو انشائیے لکھے اس کے بارے میں یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ پاشا وزیر آغا کی تحریر سے مطمئن نہیں تھے اور ان کی اصلاح کرنا چاہتے تھے (جبکہ انشائیہ نگاری میں موضوعات کی تکرار یا یکسانیت پاشا کے یہاں ہی ملتی ہے) اس لئے انہیں موضوعات کو پھر سے انشائیہ کا موضوع بنا کر انہیں عملی طور پر یہ دکھانا چاہتے ہوں کہ انشائیہ نگاری قصداً یا ارادتاً نہیں کی جاتی بلکہ انشائیہ ادیب کا ایک فطری عمل ہے جو کسی تحریک یا سبب کے ردِعمل میں وجود میں آتا ہے۔ وزیر آغا کی انہیں کمیوں کی طرف ڈاکٹر نصیر احمد خاں نے بھی اشارہ کیا ہے اور ان کے تینوں انشائیوں کے مجموعوں (خیال پارے، چوری سے یاری تک، اور دوسرا کنارہ) کے بارے میں کہا ہے کہ ان کے انشائیے خود انہیں کی ایجاد کی ہوئی انشائیہ کی تعریف کے میزان پر پورے نہیں اترتے۔ پاشا بھی ادبی اصلاح اشارۃً کرتے رہتے ہیں اور معیاری ادب کی جستجو میں رہتے ہیں۔ پاشا کی انشائیہ نگاری اسکی دلیل ہے۔ وہ یکسانیت اور تکرار کے قائل نہیں بلکہ وہ تبدیلی چاہتے ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں:

گراموفون یا ریکارڈ پلیئر پر فلمی گانوں کے ریکارڈ سننے کا تو آپ کو بھی شوق ہوگا؟ تو پھر آپ کو یہ بھی تجربہ ہوگا اگر گانا ہو رہا ہے

پیا ملن کو جانا ہے

اس گھٹے پر ریکارڈ پر کہیں گراموفون کی سوئی پھنس گئی تو بس اس کو ریکارڈ دہراتا رہے گا

جانا ہے.........جانا ہے.........جانا ہے

یہاں تک کہ آپ سوئی اٹھا کر آگے بڑھا دیں گے اور تکرار ختم ہو جائیگی۔"

(بور۔ آجکل دہلی جون ۱۹۸۴ء صفحہ ۴۰)

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ پاشا کی انشائیہ نگاری، انشائیہ کے ضمن میں ایک نیک فال ہے۔ جس سے ادب اور ادیب کی اصلاح بھی ہوئی اور خوشگوار اضافہ بھی جس سے خالص انشائیہ نگاری کو جلا ملی اور خالص انشائیہ نگار نے بھی فیضان حاصل کیا اور انشائیہ کی راہ ہموار ہوتی گئی انشائیہ نگاری کا سفر بھی آسان ہوتا گیا۔ پاشا انشائیہ نگاری کی راہ میں ایک ٹمٹماتے چراغ کی مانند ہیں جس کی روشنی سے اجالا ہوتا ہے اور ٹمٹماہٹ سے نشیب وفراز کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہنے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کی تحریک ملتی ہے جو بلاشبہ آمد کی کیفیت سے لبریز ہے۔

☆☆☆☆☆

امدادی کتب

نام مصنف	نام کتاب	ناشر/پبلشر	مقام	سال
آغا، ڈاکٹر وزیر	انشائیہ کے خدوخال	مکتبہ فکر و خیال	لاہور	۱۹۹۰ء
اختر، ڈاکٹر سلیم	انشائیہ کی بنیاد	شان ہند	دہلی	۱۹۵۹ء
بخاری، احمد شاہ پطرس	مضامین پطرس	ادبی دنیا	دہلی	۱۹۷۳ء
پاشا، احمد جمال	اندیشۂ شہر	نیو پبلشرز، آمین آباد	لکھنؤ	۱۹۶۵ء
پاشا، احمد جمال	پتیوں پر چھڑکاؤ	پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ	سیوان	۱۹۸۶ء
پاشا، احمد جمال	ستم ایجاد	کتاب پبلشرز، چوک	لکھنؤ	۱۹۶۶ء
پاشا، احمد جمال	ظرافت اور تنقید	پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ	سیوان	۱۹۸۴ء
پاشا، احمد جمال	مضامین پاشا	مکتبۂ دین و ادب	لکھنؤ	۱۹۷۳ء
جعفر، ڈاکٹر سیدہ	اردو مضمون کا ارتقاء	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس	حیدر آباد	۱۹۷۲ء
حسنین، ڈاکٹر سید محمد	صنف انشائیہ اور انشائیے	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	۱۹۹۰ء
حسنین، ڈاکٹر سید محمد	نشاط خاطر	دائرہ ادب	گیا	۱۹۸۰ء
خاں، ڈاکٹر نصیر احمد	آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ	اردو اکادمی، دہلی	دہلی	۱۹۹۳ء
سندیلوی، ڈاکٹر سلام	ادب کا تنقیدی مطالعہ	فروغ اردو	لکھنؤ	۱۹۵۹ء
قاصد، سید شاہ علی اکبر	ترنگ	مکتبۂ خیال، سبزی باغ	پٹنہ	۱۹۳۳ء
قریشی، ڈاکٹر وحید	اردو کا بہترین انشائی ادب	مکتبۂ میری لائبریری	لاہور	۱۹۸۹ء
مرتضیٰ، سید صفی	اردو انشائیہ	نسیم بک ڈپو	لکھنؤ	۱۹۶۱ء
نابھوی، رام لعل	آم کے آم	از خود	نابھہ	۱۹۸۶ء
نظیر صدیقی	شہرت کی خاطر	کتاب گھر	ڈھاکہ	۱۹۶۱ء
وشسٹ، ڈاکٹر جاوید	انشائیہ پچیسی	سلوچنا پرکاشن	دہلی	۱۹۸۵ء
وشسٹ، ڈاکٹر جاوید	ملا وجہی کے انشائیے	بک سروس	دہلی	۱۹۷۲ء

اخبارات و رسائل

نام	مقام	تاریخ
آج کل	نئی دہلی	دسمبر ۱۹۵۳ء
آج کل	نئی دہلی	جون ۱۹۵۳ء
آج کل	نئی دہلی	جون ۱۹۵۳ء
اردو پنچ	راولپنڈی	شمارہ ۵۰
اوراق	لاہور	مارچ، اپریل ۱۹۷۲ء
اوراق	لاہور	ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۳ء
اوراق	لاہور	ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۱ء
زبان و ادب	پٹنہ	اپریل تا جون ۱۹۸۳ء
شاعر	بمبئی	مئی ۱۹۸۳ء
کتاب نما	نئی دہلی	اکتوبر ۱۹۸۳ء
کتاب نما	نئی دہلی	نومبر ۱۹۸۳ء
کتاب نما	نئی دہلی	دسمبر ۱۹۸۹ء
کتاب نما	نئی دہلی	جنوری ۱۹۸۹ء
معلم اردو	لکھنؤ	جنوری ۱۹۸۸ء
معلم اردو	لکھنؤ	اگست ۱۹۹۰ء
نیا دور	لکھنؤ	اکتوبر ۱۹۶۱ء
نیا دور (خصوصی نمبر)	لکھنؤ	مارچ تا ستمبر ۱۹۸۸ء

اردو انشائیہ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہلکے پھلکے مضامین جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ وہ ہلکے پھلکے مضامین جسمیں مزاح وظرافت کی چاشنی ہو۔ اس غلط فہمی سے انشائیہ کو پہلی بار اختر اورینوی نے نجات دلائی اس لئے اردو میں انشائیہ کی اصطلاح کی شروعات ڈاکٹر اختر اورینوی نے کی اس روایت کو ڈاکٹر محمد حسنین نے آگے بڑھایا اور بعد میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو انشائیہ کی تحریک کو پائیداری بخشی۔ جس سے کچھ غلط فہمیاں بھی پیدا ہوگئیں۔ وزیر آغا نے انشائیہ کی تحریک آگے بڑھائی مگر ان کی تحریک میں صرف چند حضرات ہی شامل تھے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہی انشائیہ اور انشائیہ نگار ہیں جس کو وزیر آغا مانتے ہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت سے انشائیہ نگار اور انشائیے موجود ہیں جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

تقسیم ہند کے بعد اردو میں طنز و مزاح کا ذکر جہاں کہیں بھی ہوا احمد جمال پاشا کا نام اس میں ضرور شامل کیا گیا۔ احمد جمال پاشا اردو ادب میں بہ حیثیت طنز و مزاح نگار جانے جاتے ہیں۔ ان کے ادبی سفر کی شروعات ۱۹۵۰ء میں لکھنؤ سے ہوئی جو وقت اور حالات کے موافق لکھنؤ سے علی گڑھ، علی گڑھ سے لکھنؤ، اور لکھنؤ سے سیوان (پاشا کی سسرال، جہاں وہ لکھنؤ سے منتقل ہوئے اور تاحیات اقامت گزیں رہے) تک جاری رہا، انھوں نے اپنے ادبی سفر کی ابتداء طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھ کر کی اور گاہے بہ گاہے زبان کا مزہ بدلنے کے لئے کبھی وہ بچوں کے ادیب بن جاتے تو کبھی تنقید نگار کبھی سنجیدہ مضامین لکھنے لگتے۔ یعنی احمد جمال پاشا تہہ دار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایسے نثر نگار تھے جن کو غیر افسانوی نثر میں مہارت حاصل تھی۔ ادبی سفر کے آغاز میں طنز و مزاح کا جامہ زیب تن کیا تو مرتے دم تک کبھی نہ اتارا بلکہ کبھی کبھی اس لباس پر وہ کوئی دوسرا لباس زیب تن کر لیتے مگر یہ ان کی مستقل پوشاک نہ تھی۔ ان کے اسلوب میں طنز کا غالب رنگ ملتا ہے زندگی کی آخری دہائی میں انھوں نے وقت اور حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کبھی طنز و مزاح کی شاہراہ کا سفر کیا تو کبھی پگڈنڈی پر چل نکلے۔ یہ پگڈنڈی ہی ان کی انشائیہ نگاری ہے۔ طنز و مزاح اور احمد جمال پاشا ایک دوسرے کے لازم و ملزوم بن چکے تھے مگر جب اردو انشائیہ بحث کا موضوع بنا ہوا تھا تو انھوں نے بھی انشائیہ کی طرف ارادی طور پر رجوع کیا اور فن انشائیہ کا بغور مطالعہ کیا بذریعہ مضمون وہ انشائیہ کی بحث میں شریک ہوئے اور بعد میں وہ باضابطہ طور پر خود انشائیہ لکھنے لگے۔ انکے انشائیوں کا کوئی مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آسکا۔

Title Farid Gusr # 00811883969

اردو انشائیہ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہلکے پھلکے مضامین جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ وہ ہلکے پھلکے مضامین جسمیں مزاح و ظرافت کی چاشنی ہو۔ اس غلط فہمی سے انشائیہ کو پہلی بار اختر اورینوی نے نجات دلائی اس لئے اردو میں انشائیہ کی اصطلاح کی شروعات ڈاکٹر اختر اورینوی نے کی اس روایت کو ڈاکٹر محمد حسنین نے آگے بڑھایا اور بعد میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو انشائیہ کی تحریک کو پائیداری بخشی۔ جس سے کچھ غلط فہمیاں بھی پیدا ہوگئیں۔ وزیر آغا نے انشائیہ کی تحریک آگے بڑھائی مگر ان کی تحریک میں صرف چند حضرات ہی شامل تھے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہی انشائیہ اور انشائیہ نگار ہیں جس کو وزیر آغا مانتے ہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت سے انشائیہ نگار اور انشائیے موجود ہیں جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔